بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یادِ صد سالہ

مشاهدات و تأثرات

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

کا یک صدی علمی سفر

محمد یحییٰ بن عبد الحفیظ قاسمی

ناشر

مکتبہ نعیمہ

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ ہیں

نام کتاب	:	یادِ صد سالہ ؛ مشاہدات و تأثرات
مرتب	:	محمد یحییٰ بن عبد الحفیظ قاسمی
کمپوزنگ	:	رحمانی گرافکس،9270708963
صفحات	:	72
اشاعت	:	پہلا ایڈیشن2025ء
قیمت	:	
ناشر	:	مکتبہ نعیمہ ، ممبئی
ملنے کے پتہ	:	ادارۂ صدیق ڈابھیل 9664918503 مکتبہ نعیمہ ممبئی 9819886832

نمبر	عناوین	صفحہ
۱	تقریظ	۶
۲	پیشِ لفظ	۸
۲	اکابر علمائے دار العلوم دیوبند کی ڈابھیل آمد پر صد سالہ عظیم الشان اجتماع	۱۰
۳	اور ایک عالم کی زبانی ایک عامیانہ اعتراض	۱۰
۴	اربابِ جامعہ ڈابھیل کے مقاصد	۱۰
۵	جامعہ ڈابھیل کا اجلاس صد سالہ اور میرے پہلے استاذ (اپنے اپنے محسنوں کی یادیں)	۱۳
۶	اجلاس صد سالہ اور ہمارے درسی ساتھیوں کی بے تابی (ایک تحریر ساتھیوں کے نام)	۱۷
۷	اجلاس صد سالہ اور فضلاء کی ملاقاتیں	۲۲
۸	قابل فخر اعزاز	۲۵
۹	حق ثابت ہو کر ہی رہتا ہے (اجلاس صد سالہ میں ایک تاریخی مطالعہ)	۲۷
۱۰	بدعات کی تاریکیوں سے مشرقین میں ہدایات کی ضو فشانی تک	۲۷
۱۱	صد سالہ اجلاس کی فضلائے جامعہ کی دوسری خصوصی مجلس (حضرت مولانا اسماعیل صاحب چاسوی دامت برکاتہم کی تقریر کا خلاصہ)	۳۲
۱۲	ظرافتیں	۳۶
۱۳	صد سالہ اجلاس کی فضلائے جامعہ کی دوسری خصوصی مجلس (اساتذۂ جامعہ اساطین ملت کی جامع مانع قل و دل نصائح)	۳۸

نمبر	عناوین	صفحہ
۱۴	محبوب علماء و الصلحاء سیدی و سندی حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم عنوان :علمائے امت کی ذمہ داریاں۔	۴۰
۱۵	حضرت الاستاذ مفتی عباس صاحب بسم اللہ دامت برکاتہم عنوان: اپنی خدمات میں تاثیر کیسے پیدا کریں	۴۳
۱۶	حضرت الاستاذ مفتی محمود صاحب باردولی مدظلہ عنوان: رسم و رواج اور بے جا تبصروں سے اجتناب	۴۴
۱۷	حضرت الاستاذ مفتی حفظ الرحمن صاحب سمکلی مدظلہ عنوان:عالم کے لیے مطلوبہ اوصاف وخصوصیات	۴۴
۱۸	حضرت الاستاذ مفتی ابو بکر صاحب پٹنی مدظلہ عنوان : بڑھتا ہوا ارتداد لمحہ فکریہ اور طریق کار	۴۵
۱۹	اجلاس صد سالہ میں آئے ہوئے سبق آموز واقعات	۴۷
۲۰	محدث انور کی شان:	۴۷
۲۱	شاہ صاحب کا تقوی و تواضع اور احسان سپاسی :	۴۷
۲۲	تنخواہ میں احتیاط:	۴۷
۲۳	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بے نفسی:	۴۸
۲۴	ایک مرتبہ آپ کی زوجہ محترمہ عرض نے کیا:	۴۸
۲۵	مفتی صاحب ایک نعش تھے جو زمین پر چل رہے تھے:	۴۸
۲۶	مفتی صاحب کا دنیوی آرام سے رشتہ بقدر ضرورت تھا:	۴۹
۲۷	حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام :	۴۹

نمبر	عناوین	صفحہ
۲۹	کس شان کے عالم ہیں؟	۴۹
۳۰	علامہ کشمیری پر مہربان دو بجنوری خاندان:	۴۹
۳۱	وائرل تصویر کی تردید:	۵۰
۳۲	حضرت مولانا احمد رضا صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ:	۵۰
۳۳	خرافات کے باوجود حق کی طرف میلان:	۵۱
۳۴	پٹیل صاحب کا عرس نہ کرنے کا عزم مصمم:	۵۱
۳۵	علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دار العلوم چھوڑنے کی وجہ:	۵۲
۳۶	جامع تعلیم الدین ڈابھیل کے دورۂ حدیث کے سو سالہ جلسے کے کچھ چنے ہوئے موتی	۵۶
۳۸	صد سالہ اجلاس نے ہمیں کیا دیا (سبق آموز پیغام اور نتائج و اثرات)	۶۰
۳۹	جامعہ ڈابھیل کا صد سالہ اجلاس؛ پیش منظر و پس منظر	۶۲
۴۰	ترانہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل- سملک گجرات	۶۸

تقریظ

''جامعہ ڈابھیل'' ایک ایسا نام ہے جس کو سنتے ہی فرطِ محبت سے دل مچل جاتا ہے، طبیعت میں فرحت و انبساط پیدا ہوجاتی ہے، ساتھیوں کی پرانی صحبتیں، پرلطف مجلسیں اور اساتذہ کے علمی افادات و تحقیقات، انکے تبصرے و تذکرے ایک ایک کرکے حافظہ کے اندر ابھرنے لگتے ہیں اور ماضی کے سنہری لمحات نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ یقیناً میں نے جامعہ میں اپنی زندگی کے سب سے زیادہ سکون و مسرت کے دن گذارے ہیں۔ جامعہ نے ہمارے شعور کو جلا بخشی، قرآن و سنت اور اس سے متعلقہ علوم سے بہرہ ور کیا، بولنا اور لکھنا سکھایا۔

جامعہ ڈابھیل برصغیر کے معروف جامعات میں سے ایک عظیم جامعہ ہے، ''جامعہ ڈابھیل'' صرف ایک چہار دیواری کا نام نہیں ہے بلکہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ایک مستقل تحریک ہے، جامعہ فیضانِ نبوت کا پاسباں اور معرفتِ الٰہی کا مرکز و منبع ہے، جو ڈابھیل سے ہند و بیرونِ ہند، ایشیاء یورپ امریکہ افریقہ غرضیکہ تاحد کائنات، افق عالم کے چپہ چپہ میں اسلام کے دعاۃ بھیج رہا ہے اور کرۂ ارض کی تاریکیوں کو اپنے فیضانِ ہدایت سے منور اور پرنور کر رہا ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ جامعہ نے ہمیں اپنی آغوش میں لے کر ہماری دیرینہ تمناؤں کے پھول کھلائے۔

جامعہ میں اکابر دیوبند کے ورودِ مسعود کے سو سال مکمل ہوچکے تھے، وہ اکابر جن کے قدومِ میمنت لزوم سے جامعہ شیراز و یمن کا ہمسر بن گیا، اور اس چھوٹے سے قصبے (ڈابھیل) میں قائم جامعہ، جامعہ ازہر سے آنکھیں ملانے لگا، فضائیں معطر و منور ہوگئیں، اور پورا خطہ قال اللہ و قال الرسول کی صداؤں سے گونج اٹھا۔

اس ایک صدی میں بڑے بڑے انقلاب آئے، بڑے سیاسی طوفان اٹھے، اور آندھیاں چلیں، ملک تقسیم ہوا، لیکن اس تیز و تند ہواؤں میں بھی یہ چراغ برابر جلتا رہا، نہ یہاں کی علمی سرگرمیوں میں کچھ فرق آیا اور نہ یہاں کے ماحول میں کوئی تبدیلی ہوئی، اس عرصہ میں نہ جانے کتنے داعیان اسلام اور محدثین و اساطین علم پیدا ہوئے۔ اور اپنے اپنے علاقوں میں دین کی شمع کی روشن کرگئے، اور اسی علاقہ میں آسودۂ خاک ہوگئے۔ اس قدر طویل عرصہ سے جامعہ کی مسلسل خدمات یقیناً یہ عنداللہ مقبولیت کی علامت ہے۔ آج اس پرمسرت گھڑی کو گذر کر ایک صدی بیت چکی ہے، جامعہ نے اپنے جگر گوشوں کو آواز دی، ہر کوئی وارفتہ قدموں سے دیوانہ وار ڈوڑتا ہوا جامعہ کے اجلاس میں شریک ہوا، اور ایک بار پھر جامعہ نے اپنے فرزندان کو اپنی آغوش میں لیکر روحانیت کا صور پھونک دیا۔

۱۹۹۰ء میں داخل ہونے والے مجھ جیسے کم مایہ طالب علم نے اپنی محنت وجستجو کے ساتھ پورے نو سال جامعہ میں گذارے، جب داخلہ ہوا تو دل گھبرایا ہوا تھا لیکن جب فارغ ہو کر جارہا تھا تو آنکھیں اشکبار اور دل بے قرار تھا۔ لیکن اس دن سے لیکر آج تک جامعہ و اساتذہ جامعہ سے بے پناہ محبت کو میں اپنے لئے سرمایہ نجات سمجھتا ہوں۔ اور آج بھی اساتذہ کی پدارنہ شفقت اور مربیانہ عنایت اور اپنی نااہلی کو یاد کرتا ہوں تو سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ بہرحال! جب جامعہ کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو وقت کا پتہ نہیں چلتا۔ محفلیں زعفران زار ہوجاتی ہیں اور دل مضطر کو ایک گونہ سکون ملتا ہے اللہ تعالیٰ جامعہ کے فیض کو عام وتام فرمائے۔ آمین

جامعہ کے اجلاسِ صد سالہ پر بہت سے فضلاء نے مضامین لکھے، کئی دن تک واٹس ایپ گروپوں پر اجلاس کا چرچہ ہوتا رہا، اسی عرصے میں جامعہ کے ایک ہونہار فاضل و خوشہ چیں، عمدہ صلاحیت کے حامل، اپنے اقران و اماثل میں کامل، برادرم مفتی یحیٰ بن مولانا عبدالحفیظ قاسمی زیدہ مجدہ نے بھی صد سالہ اجلاس پر اپنے اشہب قلم سے پورے اجلاس کی خوب منظر کشی کی، اور اپنی دوربیں نگاہوں سے اجلاس کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور اسے قلمبند کیا، اسطرح انھوں نے یہ اجلاس تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا، مزید برآں یہ کہ انھوں نے اجلاس کی دوسری نشست میں بیان کئے گئے اساتذۂ جامعہ کے افادات کو بھی جمع کر کے اس کتاب کو مزید چار چاند لگادیئے۔ اس طرح یہ کتاب ایک کتاب نہیں بلکہ ایک تاریخی دستاویز بن گئی۔ مفتی صاحب کے مضامین متنوع عناوین پر مشتمل ہوتے ہیں، جب قلم اٹھاتے ہیں تو اس کا حق ادا کرتے ہیں، ان کی مضامین جاذب اسلوب کے ساتھ بہت ہی سادہ وسلیس و دل نشین ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اب تک چند کتابیں بھی چھپ کر افادۂ عام کے لئے دستیاب ہیں۔

ع ۔۔۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

اب یہ کتاب طباعت کے مرحلہ سے گذرنے والی ہے، اس موقعہ پر کتاب کے خوبصورت ماتھے پر سیاہ ٹیکہ لگانے کی ذمہ داری مجھے دی گئی تا کہ نظر نہ لگ جائے۔ لیجئے وہ کام بھی میں نے تعمیل حکم میں کر دیا۔ جزاک اللہ خیراً

یکے از فضلاء جامعہ ڈابھیل

(مفتی) محمد غیاث محی الدین (حیدرآبادی)

فاضل جامعہ؛ سن فراغت از افتاء ۱۹۹۹ء

پیشِ لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْأَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِینَ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ أَجْمَعِینَ.

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل (گجرات) برصغیر کے ان تاریخی علمی و دینی اداروں میں سے ہے جنہوں نے ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک قرآن و سنت کی تعلیم، فقہ و افتاء کی خدمت، اور دعوت و اصلاحِ امت کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ یہ وہ گلشنِ علم و عرفان جس کی فضاؤں میں ایک صدی سے قرآن و سنت کی خوشبو مہک رہی ہے۔ اس علمی قلعے نے اپنے قیام سے آج تک جس تسلسل، توازن اور اعتدال کے ساتھ علم وعمل کی مشعل کو روشن رکھا، وہ اس کے بانیانِ مخلص، اساتذۂ محققین، اور طلبۂ صادقین کی خالص دینی حمیت کا مظہر ہے۔

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل نے جب اکابرین علمائے دیوبند اور قافلۂ انوری کے ورود مسعود کے صد سالہ تکمیل کا جشنِ تشکر و تجدیدِ عہد کے طور پر منایا تو یہ محض ایک تقریبی یا رسمی اجتماع نہیں تھا، بلکہ علمی و روحانی تاریخ کا وہ عظیم لمحہ تھا جس میں ماضی کی تابناکی، حال کی فعالیت، اور مستقبل کی امیدیں ایک ساتھ جلوہ گر ہوئیں۔

مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی کہ اکابرین دار العلوم دیوبند کے ورودِ مسعود کے موقع پر منعقد اس صد سالہ اجلاس میں، میں نے چند مضامین قلم بند کیے جو اس عظیم الشان اجتماع کے مختلف پہلوؤں کا آئینہ ہیں—کبھی اجلاس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی، کبھی اس کے اسباق و عبر و نتائج پر نظر دوڑائی، کہیں اساتذۂ جامعہ کی پر اثر گزارشات نقل کیں، اور کہیں اس ایک دن میں محسوس ہونے والی جامعہ کی صدی بھر کی تاریخ کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

یہ مضامین، جو دراصل قلب وقلم کی مشترکہ ترجمانی ہیں، اب میں نے ایک مختصر کتابی صورت میں پیش کیے ہیں تا کہ یہ تاثرات و مشاہدات زیادہ سے زیادہ اہلِ دل و فکر تک پہنچ سکیں، اور اس تاریخی موقع کی روحانی معنویت باقی رہنے پائے۔

اس مجموعہ میں میں نے جامعہ کے ایک جلیل القدر استاذ، فاضلِ موقر مفتی معاذ صاحب کا وہ مقبول و مشہور مضمون بھی شامل کیا ہے جو انہوں نے صد سالہ اجلاس کے بعد رقم فرمایا—جس

میں انہوں نے نہایت عالمانہ بصیرت کے ساتھ اس اجتماع کے پس منظر و پیش منظر، مالہ و ماعلیہ اور علمی و تربیتی اثرات کا جائزہ لیا ہے۔

امید ہے کہ یہ کتابچہ نہ صرف جامعہ کی مبارک مساعی کا آئینہ ثابت ہوگا بلکہ نئی نسل کے لیے بھی ایک فکری و جذباتی اثاثہ بنے گا— تا کہ وہ جان سکے کہ ان کے اسلاف نے علم و دین کی خدمت میں کس خلوص و عزم سے اپنی زندگیاں صرف کیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے، اسے صدقۂ جاریہ بنائے، اور جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل کو تا قیامت رشد و ہدایت کا مینار بنائے۔

آمین یا رب العالمین

محمد یحییٰ بن عبد الحفیظ قاسمی

اکابر علمائے دار العلوم دیوبند کی ڈابھیل آمد پر صد سالہ عظیم الشان اجتماع

ایک عالم کی زبانی ایک عامیانہ اعتراض

جب سے بذریعہ واٹس "اس پرشکوہ تقریب" کی اطلاع عام ہوئی ہے؛ فرزندان جامعہ میں خوشی کے ایک لہر ہے. ہر سال کے فارغ طلباء اپنے اپنے ہم درسوں سے ملاقات کرنے کے منصوبہ بنا رہا ہے۔ جامعہ ڈابھیل کے فضلاء کے تمام گروپ میں ایک نئی چمک دمک اور نشاط و تازگی ہے۔ بہت سے ایسے گروپ جس میں جامعہ ڈابھیل کے خوشہ چیں کی صرف شمولیت ہے اور اس گروپ میں مختلف مدارس سے فارغ التحصیل علماء، جدا جدا ذہنیت رکھنے والے احباب کی بھی شرکت ہے، وہ گروپ بھی فرزندان جامعہ ڈابھیل کی اظہار خوشی سے محروم نہیں رہے۔

جو علماء علمائے دیوبند سے والہانہ تعلق رکھتے ہیں ان کی تحریریں ان کی دینی پختگی اور اخلاقی اقدار کی خبر دیتی ہیں؛ انھوں نے جامعہ ڈابھیل کی اس سعی کو مشکور و منظور قرار دیا۔ ایسی تحریریں نظر سے گزری جس میں ارباب جامعہ ڈابھیل کے اس اقدام کو بنظر استحسان دیکھا اور اس کو جامعہ ڈابھیل کی احسان شناسی قرار دیا۔ لیکن کچھ احباب ایسے بھی ہیں جو اپنی تنگ نظری اور ناواقفیت کی بنا پر کہتے نظر آئے کہ یہ "کھوٹا خرچ" ہے یہ بند ہونا چاہیے، اور ان پیسوں کو غریب لڑکیوں کی شادی میں خرچ کرنا چاہیے۔

یہ اعتراض اس لائق تو نہیں کہ اس کو لائق اعتناء سمجھا جائے، لیکن ہمارے بعض بہی خواہوں کی تمنا تھی کہ کچھ لکھا جائے کیوں کہ بعض فرزندان جامعہ خود اس تقریب کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔ ایسی عالی شان تقاریب اس سے قبل بھی بڑے اہتمام کے ساتھ منعقد کیں جا چکی ہیں۔ جس کے بڑے مثبت نتائج برآمد ہوئے اور مدرسہ سے غیر منسلک اکابر حضرات نے بھی اس میں اپنا اعتماد اور تعاون پیش کیا ہے۔

ارباب جامعہ ڈابھیل کے مقاصد

کوئی پوشیدہ نہیں ہیں نہ جامعہ نے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ اپنے پہلے ہی اعلان میں اس عظیم الشان اجتماع کے اغراض و مقاصد کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ اور کچھ باتوں کو

کنایہ اور مبہم رکھا گیا؛ و الکنایۃ اشد من التصریح۔

(۱) اکابر کی احسان شناسی و سپاس گزاری (۲) ان کی خدمات کو خراج تحسین (۳) ان کے علمی، روحانی و دینی فیوض کو عام کرنا۔ (۴) اور نسل نَو کو ان کی خدمات سے متعارف کرانا۔

جامعہ کے پہلے اعلان کی عبارت ملحوظ ہو؛ ہمارا یہ پیارا ادارہ اللہ کے فضل اور اس کی بے پناہ عنایات سے کامیابی سے اپنے وجود کے ۱۲۰/ سال مکمل کر چکا ہے۔ اس کا آغاز ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء میں سملک گاؤں کی تاریخی مسجد کے صحن میں ''تعلیم الدین'' کے نام سے ایک چھوٹے سے مدرسے سے ہوا، حضرت مولانا احمد بھام رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں- جو جناب حسن بھام سملکی کے فرزند تھے-

اس کے قیام کے تقریباً ۲۰/ سال بعد، ۵/ ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء کو دار العلوم دیوبند کے تاریخی، عالمی شہرت یافتہ ادارے سے عالمی شہرت یافتہ علماء قرآن و حدیث کے حاملین جن میں ہندوستان کی آزادی میں گراں قدر خدمات سرانجام دینے والے حضرات بھی شامل ہیں؛ حضرت شاہ انور کشمیری کی قیادت میں ڈابھیل پہنچے۔ ان کی بابرکت آمد سے چھوٹا ''تعلیم الدین'' مدرسہ ''جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک'' کے عظیم مدرسہ میں تبدیل ہو گیا۔ بزرگوں کی آمد سے ڈابھیل سملک کی زمین و آسمان بدل گئے۔ نامور علمائے کرام کے اس کارواں کی آمد سے مدرسہ میں ایسی علمی و روحانی ترقی ہوئی کہ یہ ایک تاریخی مدرسہ بن گیا، جس کی خیر و برکت سے عالم اسلام آج بھی خوشیاں منا رہا ہے۔ موجودہ سال ۱۴۴۶ ہجری میں اس ''مبارک ورود مسعود'' کا سوواں سال مکمل کیا جا رہا ہے۔

اس موقع پر اور اس تناظر میں جامعہ کی جانب سے ایک عظیم الشان اجتماع اور تقریب کا انعقاد کیا جا رہا ہے جس کا مقصد نئی نسل کو ایک صدی قبل یہاں آنے والی ان عظیم ہستیوں کے علمی، روحانی مقام و مرتبہ اور ان کی گراں قدر خدمات خصوصاً جامعہ اور گرد و نواح کے لیے ان کی اعلیٰ خدمات سے روشناس کرانا اور ان کی فضیلت کے اظہار کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ انتھی کلامی

اس اجتماع کے اور بھی کئی اہم مقاصد و اغراض ہو سکتے ہیں۔ جیسے؛

(۵) اکابر علمائے دیوبند اور مسلک علمائے دیوبند سے اپنی وابستگی کا اظہار: یہ اس وقت ہے جب دار العلوم دیوبند اور اس کے مسلک پر رخنے ڈالے جا رہے ہیں اور ان کو کمزور کرنے کی سعی لاحاصل زوروں پر ہے۔

(۶) تاریخی خدمات کے تسلسل کی یاد دہانی اور عوامی اعتماد حاصل کرنا: بہت سے مخیر حضرات پیڑیوں سے جامعہ کو خدمات و تعاون پیش کر رہے ہیں ان لوگوں کو اور دیگر عوام کو تاریخی خدمات پیش کر کے اعتماد میں لینا اہمیت رکھتا ہے۔

(۷) ابنائے جامعہ میں ایکتا و یگانیت کی روح پھونک کر تازہ جوش و ولولہ پیدا کرنا تا کہ دینی خدمات عام و تام و مستحکم ہو۔ نیز اساتذہ و طلباء میں بھی جوش و جذبہ کی نئی لہر اٹھے اور خدام جامعہ کی حوصلہ افزائی ہو۔

(۸) عوام میں دعوت واصلاح کا موقع فراہم کرنا اور جامعہ کی خدمات کو وسیع کرنا۔ ان جلسوں سے عوام میں دعوت و اصلاح کا موقع بآسانی حاصل ہوجاتا ہے جو بے حد مفید ہوتا ہے۔

(۹) عزت و وقار میں اضافہ کرنا تا کہ مخیر حضرات کے لیے خدمت دین کی راہیں ہموار ہوں اور خواہی نخواہی چاہنے والوں کے ارادوں میں اضمحلال آئے۔

(۱۰) مدارس و اوقاف پر آئی افتاد سے کون ناواقف ہے، مدارس پر خطرات منڈلا رہے ہیں، ارباب مدارس اندر سے کمزوری محسوس کر رہے ہیں لہٰذا یہ اقدام قابل قدر ہونا چاہیے کہ کسی عنوان سے ابنائے جامعہ اور بہی خواہان جامعہ کو جوڑا جائے اور جامعہ کے تئیں غیر محسوس طریقہ پر ان کو فکرمند کیا جائے تا کہ خدمات جامعہ پائیدار و تابندہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ابنائے جامعہ کے اعتقاد میں پختگی کو یقینی بنایا جائے۔

جب دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ جلسہ ہوا تھا تو جمیعت کے صدر، شیخ الاسلام حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشیں، حضرت مولانا اسعد مدنی نے صد سالہ اجلاس کے لیے علاقوں کا باقاعدہ دورہ کیا تھا اور اسی عنوان سے لوگوں سے چندہ کیا تھا۔ وقف کی رقم یا زکات کے نام پر وصول کی گئی رقم اس طرح کے جلسہ میں نہیں لگائی جاتی ہے، یہ رقم اجلاس ہی کے نام پر وصول کی جاتی ہے یا لوگ از خود اجتماع کی اہمیت کے پیش نظر دیتے ہیں۔

کیا یہ صاحب (ناقد) بذات خود تقوی کے اعلی معیار پر ہیں!

ان کا کیا خیال ہے حضرت مفتی صاحب، حضرت مہتمم صاحب اور دیگر اہل اللہ اساتذہ کرام کے بارے میں کہ وہ حضرات اس طرح مالی ضیاع اور فضول خرچی اپنی نگاہوں کے سامنے نہ صرف روا رکھیں گے بلکہ اس میں شرکت کر کے تقویت بھی پہنچائیں گے۔

جامعہ ڈابھیل کا اجلاس صد سالہ اور میرے پہلے استاذ

﴿اپنے اپنے محسنوں کی یادیں﴾

آج بندہ جامعہ کے لیے اجلاس میں شرکت کی غرض سے پابرکاب ہے، میں اپنی یادوں کو ماضی کی طرف لوٹاؤں تو سخت جنوری کے کڑاکے کی سردی میں بغیر جرسی کے مروالی اسٹیشن پر اپنے آپ کو اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ڈابھیل جانے کے لیے کسی سواری کو تلاش کرتے ہوئے پاتا ہوں۔ ہماری طرح کئی اور لوگ تھے۔ مارے سردی کے بجتے ہوئے دانتوں کے ساتھ کھڑ کھڑاتی ہوئی بوسیدہ بس میں سوار ہوئے۔ ٹی سی نے بغیر ٹکٹ دیے پیسے لے کر ڈابھیل اتار دیا۔

علی الصباح فجر سے قبل کا وقت تھا کتب خانہ اور اطراف کی عمارتیں نظر نہیں آرہی تھیں، مسجد کے حوض پر بیٹھ کر میں نے یہ منظر دیکھا کہ طلباء نوم و تیقظ کی ملی جلی کیفیت لیے مسجد کی طرف آرہے ہیں، کوئی برش منہ میں دبائے چلا آرہا ہے تو کوئی آنکھیں مسلتا ہوا ست حالت میں۔ نماز فجر کی قراءت میرے لیے نئی تھی لیکن حسن قراءت کے جانچنے کے معیار سے میں ناواقف تھا، سرسری طور پر مکتب سے گزر کر ناظرہ پڑھے بغیر جامعہ آ گیا تھا۔ فجر کے بعد صبح اپنی مدھم روشنی کے ساتھ نمودار ہوچکی تھی، دار القرآن، دار الحدیث، کتب خانہ، مطبخ و بورڈنگ کی عمارتیں، وسیع راستے اور تین کشادہ میدان سورج کی ہلکی کرنوں میں جنت نظیر معلوم ہورہے تھے۔

میں ممبئی سے دہ در دہ کے ڈربے سے اُٹھ کر یہاں آدھمکا تھا، میرے بھائی نے کہا تو تو جھونپڑوں سے بلڈنگوں میں آ گیا۔ لیکن میرے لیے میرا جھونپڑا ہی عزیز تھا کیوں کہ میرے اپنے وہاں تھے، یہاں اجنبیت محسوس ہورہی تھی، مجھے آزادی پسند تھی اور یہ مدرسہ یہاں کے طلباء کو اپنے ایک مضبوط نظام میں باندھ دیتا ہے، مجھے بے راہ روی پسند تھی یہ راہ راست اور اچھی عادتوں کا خوگر بنا دیتا ہے۔ میں سست طبیعت آرام پسند تھا جامعہ چوبیس گھنٹے متحرک رکھتا ہے۔ بہر حال میں داخلہ لے کر فارسی اول میں اپنے پہلے استاذ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب منیار سورتی مدظلہ العالی کے سامنے بیٹھ گیا۔

آپ خوش وضع اور خوب صورت تھے إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ أَنْ يَرَى أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَى عَبْدِهِ کے بموجب اعلی معیار کے کپڑے، ٹوپی اور عینک زیب تن فرماتے۔ عطر کی پسند میں بھی

آپ کا ایک الگ معیار تھا، کوئی کیمیکل والا الٹا بلتا عطر لگا کر آتا تو مزاحیہ انداز میں نکیر کرتے کہ مسکراہٹ طلباء کے چہروں پر سج جاتی۔ اور نام لے کر کہتے کہ ''عود، شمامہ، مخلط، اور کچھ عطور گلاب'' لگانا چاہیے۔ اسی وقت سے ہماری طبیعت بھی اسی طرح کے عطور کو پسند کرنے لگی۔شب اول کو بھی عود اصلی بدن پر لگایا تھا حال یہ تھا کہ مجھے مہندی کی اور انھیں عود اصلی کی خوش بو پسند نہیں آئی، بہر حال اس رات کا پروسیسر جیسے تیسے پورا ہوا۔

آپ نہایت خوش مزاج اور مزاحیہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی مجلس میں بیٹھتے ہی بوجھل پن اور گھبراہٹ دور ہو جاتی۔ وہ کبھی سبق کے دوران دلچسپ لطیفے سنا دیتے، کبھی طلبہ کی عام سی غلطی کو بھی اس انداز سے درست کرتے کہ سب مسکرا اٹھتے۔ یہی ان کا خاص کمال تھا جس سے مشکل سے مشکل سبق بھی آسان اور یادگار بن جاتا۔آپ کبھی کبھی کانوں میں رس گھولتے ہوئے ایسے مزاحیہ الفاظ بول جاتے ہیں کہ جب یاد آتے ہیں ایک تازگی آجاتی ہے۔جب بندہ چہارم کے بعد چھٹیوں میں قاضی صاحب کے پاس نحو کی مختلف کتابیں پڑھ رہا تھا، صبح و شام نحو ہی میں بسر ہوتے تھے تو خانقاہ سے گھر جاتے وقت آپ مجھ سے پوچھا کہ ''انصاری کیا پڑھ رہے ہو؟'' میں نے شرح ملا جامی، شرح ابن عقیل وغیرہ کا نام لیا تو کہنے لگے ''تب تو سیبویہ خواب میں آتے ہوں گے''میں سوچ سوچ کر کافی دیر تک ہنستا رہا۔ایک مرتبہ جب میں نے اپنے بچوں کو ڈابھیل میں داخلہ کروایا تو متعجبا کہنے لگے ''ارے ابھی میرے بچے ڈابھیل میں نہیں آسکے تمہارا ماڈل یہاں آ گیا! پڑھنے کے زمانے میں نکاح کرلیا تھا کیا؟''

عربی سوم میں ترجمۂ قرآن بہت آسان کر کے پڑھاتے اور آپ کا سورۂ رحمن و سورۂ واقعہ کا درس تذکرۂ حور کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا ہے سورۂ حجرات کے بعد ہی سے طلباء سورۂ واقعہ کا انتظار کرتے۔حکایات لطیف ہر سال بذات خود پڑھاتے، اور طلباء کے قہقہوں سے درس گاہ گونج جاتی، ہمارے سال حضرت مولانا قاری عبد الحنان صاحب تشریف لے آئے اور کتاب کا اکثر حصہ انھوں نے ہی پڑھایا تھا۔بارڈولی کے ایک بڑی عمر کے صاحب تھے ان سے کہا کرتے کہ ''یہ دوست بنانے کے لائق ہیں لیکن طالب علم سے دوستی نہیں کرنی چاہیے۔''''کوساڑی'' کی عجیب و غریب حرکتیں دیکھتے اور ہنستے رہتے۔زکریا پر علامہ چاسوی کی وجہ سے خوب عنایت کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو حفظ و اتقان سے بھی وافر مقدار عطا فرمائی تھی چناں چہ ہمیں علامہ انور شاہ کشمیری کے خوب واقعات سناتے اور فرماتے کہ وہ کوئی بات پڑھ لیتے تو چالیس سال تک نہیں بھولتے تھے اور میں جو بات پڑھ لیتا ہوں پانچ سال تک نہیں بھولتا۔سبق کو سمجھ کر یاد کرنے پر

زور ڈالتے ہوئے فرماتے کہ تم علامہ کشمیری تھوڑا ہو، یاد کیا ہوا بھول جاؤ گے اور سمجھا ہوا محفوظ رہے گا۔ چاسوی صاحب سے لگاؤ کی وجہ سے احمد آبادیوں سے بھی دلچسپی تھی اور ان کے بخل کے واقعات سناتے۔ فرمایا کہ ٹرین میں ایک صاحب نے کسی سے پانی طلب کیا، اس نے نہیں دیا، کچھ دیر بعد خود پانی پیش کیا تو طلب کرنے والے کے دریافت کرنے پر کہا کہ اس وقت باہر سے احمد آباد جارہا تھا (اس کی آب و ہوا کا اثر تھا) اب اس کی حدود ختم ہوگئی ہیں، فرمایا کہ ایک کتاب ہے ''کتاب البخلاء'' اس میں بخیلوں کے انوکھے واقعات تحریر کیے ہوئے ہیں۔

علامہ کشمیری کا یہ واقعہ بھی شاید انہی سے سنا ہوا ہے کہ وہ ایک ٹرین میں سفر کر رہے تھے، دو انگریزوں کی آپس میں تکرار ہوئی، ان کا یہ معاملہ عدالت پہنچا، کوئی اور گواہ نہ ہونے کی صورت میں علامہ کشمیری کو طلب کیا گیا، انھوں نے دونوں انگریزوں کی باتیں لفظ بلفظ نقل کر دیں۔ جب کہ آپ کو انگریزی زبان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ فرمایا کہ وہ بازار میں نکلتے تو کانوں میں روئی ڈال کر نکلتے کہ مبادا کوئی غیر شائستہ بات کانوں میں پڑ جائے اور وہ یاد رہ جائے۔ فرمایا کہ بچوں کو اپنا ذاتی مطالعہ ڈالنے کی عادت ڈالنی چاہیے اور خارجی اوقات میں اسوۂ رسول اکرم ﷺ پڑھنے کی تاکید کرتے اور خود بھی زائد وقت میں خارجی کتابوں کا مطالعہ فرماتے۔

آپ محبت سے کھیلتے کھیلتے پڑھانے پر یقین کرتے تھے، آپ کی طبیعت میں نرمی تھی بھی اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کو غصہ نہیں آتا تھا۔ ہم نے نہیں دیکھا کہ آپ نے کسی طالب علم کو مارا ہو نہ ہی آپ اپنے پاس چھڑی رکھا کرتے تھے، ہاں ایک مرتبہ ایک طالب علم نے قاری عبد الحنان صاحب کے ساتھ بے ادبی کا معاملہ کیا تھا اور درسگاہ کے باہر کھڑے ہو کر بالقصد گانا گایا تھا تو چھڑی منگوا کر خوب تنبیہ کی تھی۔ حضرت اقدس مفتی صاحب سے اور جامعہ سے خوب لگاؤ رکھتے، ایک مرتبہ فرمایا کہ یہ سوچ لیا ہے کہ جامعہ سے (تدریسی) لگاؤ رکھنا ہے چاہے کم وقت کے لیے ہو۔ فرمایا کہ مہتمم صاحب نے مجھ کو کہا کہ دیکھو گاؤں میں کتنا سکون ہے، کشادہ مکان عمدہ پکوان یہاں آ کر کیوں نہیں رہتے تو فرمایا: میں نے دل میں کہا آپ شہر میں آ کر رہیں تو معلوم ہوگا کہ شہری دیہات میں آ کر کیوں نہیں رہتے۔

داخلہ لینے کے بعد پہلی ہی جمعرات آئی تھی اور مجھے گھر جانا تھا، جمعرات کی دوپہر میں آپ نے فرمایا کہ دیکھو ایک بہت بڑے بزرگ جمعہ کی شام میں آنے والے ہیں۔ ''پیر ذوالفقار نقشبندی مدظلہ'' سنا ہے کہ لوگ ان کے بیان میں چیخیں مار کر روتے ہیں، اس لیے قریب والے جو بھی گھر جانے والے ہوں وہ شام تک آجانا۔ لہٰذا میں گھر سے ممبئی گیا اور مغرب تک آ گیا اور

پیر صاحب کے بیان میں گھر کو یاد کر کے خوب رویا۔

اور بھی بہت سی حضرت مفتی عبید اللہ صاحب کی یادیں ہیں جو یادداشت سے کبھی محو نہیں ہوسکتیں۔آج جب جامعہ ، علامہ کشمیری اور ان کے رفقاء کی احسان مندی کے طور پر صد سالہ اجلاس کا انعقاد کر رہا ہے اور میں اسی کے لیے درسفر ہوں ، مجھے بھی آج اپنے محسنین یاد آرہے ہیں یقیناسب کا تذکرہ طوالت کا باعث ہوگا اس لیے میں نے اپنے اس سفر کو اپنے محسن اول، پہلے استاذ اور جامعہ ڈابھیل کے نام کیا۔ جامعہ ڈابھیل کس چیز کا نام ہے انہی اساتذہ اور ارباب اہتمام کا نام ہے۔ اگر ہم اپنے استاذ کا تذکرہ کر رہے ہیں تو درحقیقت وہ جامعہ ڈابھیل کا تذکرہ ہے۔

میں نے ان سے صرف ''فارسی اول'' کے چند ابواب نہیں پڑھے بلکہ اصل میں پڑھنے کا شوق اور ذوق پایا۔ ان کی فہمائش کا مقصد یہ تھا کہ پڑھائی محض کتاب ختم کرنے کا نام نہیں بلکہ علم کو دل و دماغ میں بٹھانے کا عمل ہے۔ ان کے خوش اخلاق اور مزاحیہ رویے نے مجھے یہ احساس دلایا کہ تعلیم اگر شوق سے حاصل کی جائے تو کبھی بوجھ نہیں لگتی۔

آج جب میں اپنی تعلیمی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ اگر میرے پہلے استاذ کا وہ مزاحیہ اور محبت بھرا انداز نہ ہوتا تو شاید میں علم کے اس راستے پر جم کر کھڑا نہ رہ پاتا۔ میں نے تو اس سوچ کے ساتھ داخلہ لیا تھا کہ بقرہ عید تک پڑھ کر دیکھتے ہیں اگر اچھا نہیں لگتا تو گھر آجائیں گے لیکن مجھے پہلے استاذ کے طور پر مفتی عبید اللہ صاحب مل گئے۔ زندگی کے سفر میں بہت سے استاد ملتے ہیں، مگر پہلا استاذ وہ چراغ ہے جس کی روشنی کبھی مدھم نہیں ہوتی۔ دل کے افق پر وہ ہمیشہ ایسے ہی روشن رہتا ہے جیسے بچپن کی کوئی پیاری یاد، جیسے پہلی بار علم کی خوشبو محسوس کرنا اور جیسے پہلا پیار۔

میرے پہلے استاذ محض استاد نہیں ہیں،وہ میرے دل کے معمار ہیں۔ ان کی مسکراہٹ میری کتاب کے اوراق پر آج بھی جگمگاتی ہے،ان کے لطیفے میرے حافظے کی گلیوں میں اب بھی گونجتے ہیں، اور ان کی شفقت میری سوچوں میں ہمیشہ شامل رہتی ہے۔سب سے بڑھ کر ان کا مزاحیہ انداز تھا جس نے ہمیں تعلیم کے خشک صحرا میں بھی ہنسی کے نخلستان عطا کیے۔ اسی انداز نے ہمارے ذہنوں پر ایسے نقوش چھوڑے جو آج تک تازہ ہیں۔ ان کی محفل میں بیٹھنے والا طالب علم کبھی اکتاہٹ محسوس نہ کرتا۔ ان کا درس علم کے ساتھ ساتھ دلوں کی تربیت بھی کرتا، اور یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔

اجلاس صد سالہ
اور ہمارے درسی ساتھیوں کی بے تابی

﴿ایک تحریر ساتھیوں کے نام﴾

۱۳؍ جنوری ۲۰۰۱ء مطابق ۱۴۲۱ھ شوال کا دوسرا عشرہ تھا میں جامعہ ڈابھیل میں داخلہ کے لیے مدرسہ آیا، یوں کہہ لیجیے کہ لایا گیا، ہمارے علاقہ اور خاندان میں عالم بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے میرے بڑے بھائی مجھے دسویں کے بعد مدرسہ لے آئے۔ اس سے پہلے کسی مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی، لہٰذا قاری رضوان صاحب دامت برکاتہم نے مجھے ناظرہ میں ناکام کر دیا، لیکن بھائی کے اصرار کرنے اور بھائی کے پلکوں سے آنسو چھلکنے نے قاری صاحب کا دل نرم کر دیا، اور بقرہ عید تک ناظرہ کی تصحیح کی شرط پر ''فارسی اول کے لیے چل جائے گا'' لکھ دیا۔

کتب خانہ سے کتاب دے کر درسگاہ میں بٹھا دیا گیا، بھائی گھر کے لیے روانہ ہوگئے، میں یہاں تنہا، کسی سے شناسائی نہیں دوسرے طلباء کو دیکھتا کہ ان کے گاؤں والے یا رشتہ دار پہلے سے یہاں پڑھتے ہیں، ان کا رہن سہن خالی اوقات ساتھ گزارنا، ضرورت کے موقع پر کام آنا، دل لگی و دل بستگی سب ان کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے اپنے کو بہت تنہا محسوس کیا، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اسی درسگاہ سے مجھے ایسے ساتھی ملنے والے ہیں، جن کا ساتھ قدیم ساتھیوں کی قدامت سے بھی قدیم ہونے والا ہے، جن سے موافقت اپنوں سے بھی زیادہ باقی رہنے والی ہے، جن سے بے تکلفی خاتونِ خانہ کو بھی ٹکر دینے والی ہے، جن کے ساتھ مشاورت و معاونت رشتہ داروں جیسا ہوگا۔ جو دستر ہی کے نہیں بستر (کمرہ) کے بھی شراکت دار ہوں گے۔ جن کا وجود بہت سی کمیوں کو پر کرنے والا ہوگا، جن کے ساتھ خوشی ہی میں نہیں غم میں بھی حصہ داری ہوگی۔ میں درس گاہ میں جا بیٹھا، دار القرآن میں دوسرے منزلہ پر فارسی اول (ب)۔ وہاں چاسا چاپلدھرا، آکولہ ویسما، کاوی بارڈولی، گودھرا احمد آباد، وانکانیر جمبوسر وغیرہ کے طلباء سے میرا سابقہ پڑا۔

یہ وہی اجنبی چہرے تھے جن میں سے بعض آگے جاکر جیون ساتھی ہم درس ہم پیالہ و ہم

نوالہ بننے والے تھے۔ میرا تعارف ہوا زکریا، ساجد سے اور ویسما والے سہیل اور مصعب منصوری سے۔ ہم پانچ ساتھی فارسی دوم نہ پڑھ کر آگے کی طرف ساتھ کود گئے اور مابقی ساتھیوں کو پیچھے نہیں بلکہ آگے چھوڑ دیا۔ فارسی دوم نہ پڑھنے کا قلق عموماً ہمیں رہا۔ عربی اول میں ملنے والی جماعت نے قلق کو قلقلہ (مزید اضطراب) میں بدل دیا، شرارت اور طوفانی میں مشہور، پڑھائی اور محنت سے کوسوں دور، شریفوں اور شریروں سے ملی جلی محبین کی ایک جماعت۔ جس میں کنجری اور تاراپور کے شریف نظر آنے والے طلباء بھی تھے اور بھروچ کے جدا جدا ضلعوں کے رفقاء بھی جو لڑتے ہوئے اور بتیاتے ہوئے یکساں معلوم ہوتے تھے، کشمیر کی کلی بھی یہاں کھلی تھی اور پالنپوری پھول بھی۔ بمبئی والے سہیل بھی حفظ سے سیدھا یہیں قدم رنجیدہ ہوگئے تھے۔ ہانسوٹ کی ناخوش گوار ہوا نے احمد آباد کے سونی والا کو بھی یہیں لا ڈالا تھا۔

پھر ہم تین جگہ بٹ گئے۔ بھلا ہوا حضرت مفتی اسعد خانپوری دامت برکاتہم کا کہ انھوں نے بہت سے قیمتی طلباء کو اپنی درس گاہ عربی اول (ج) میں جگہ دی، بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ اپنا سر لے لیا۔ ہمارے حصہ میں عربی اول (ب) مفتی یوسف صاحب ہانس کی درسگاہ آئی اور انھوں نے ہمیں کم بخت سے نیک بخت بنا دیا۔ یہاں سے سہیل کنجری سہیل بمبوی، شاہد پالنپوری شاہد بمبوی جیسے حضرات کا ساتھ مقدر رہا۔ عربی اول بڑی مشکل سے صرف نحو کو رٹا مارتے مارتے پورا ہوا، عربی دوم میں قدم رکھا تو یہاں تین شخصیات کا پودرا کی اور تین شخصیات پانامہ کی سے واسطہ پڑا، ابتداء میں لگتا نہیں تھا کہ یہ واسطہ اتنا مضبوط ہو جائے گا جو روح کے قفص عنصری سے جدا ہونے کے بعد ہی ٹوٹے گا۔ یہ چھ کے چھ حضرات ابتداء دیکھنے میں تو بہت شریف لگ رہے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کی شرافت کا پوٹلا اترتا گیا، اور سالم کے تو میں بازو ہی میں بیٹھتا تھا ایک دوسرے کے خد و خال سے ہم بہت جلد واقف ہوگئے۔ یہاں ایک ایسے شخص بھی ملے کہ جن کے بارے میں فیصلہ ہی دشوار تھا کہ یہ صاحب شریفوں کی فہرست میں آتے ہیں یا شریروں کی۔ وہ صاحب تھے دھرم پوری۔ گاؤں کے اسد کوٹھی بھی ملے جنھوں نے ایک بڑے حادثہ سے ہمیں بچایا تھا اور ظہیر لیلا بھی اپنے ہم درسوں سے پیچھے رہ کر ہمارے ساتھ ایسے جڑ گئے جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہوا ہوتا ہے۔

حضرت مولانا ابراہیم صاحب کے سخت تربیتی انداز نے ہم ناہنجاروں کو اپنی اوقات کا پتا

دیا، صرف نحو سے اچھی خاصی واقفیت دی۔ سہیل بمبوی اس سال بھی اول رہے ان کو ٹکر دینے والے سہیل کنجری اس سال دوسری درسگاہ میں جلوہ افروز تھے۔اس سال ہمارے ایک قیمتی ساتھی ہم سے اپنے بعض اعذار کی وجہ سے جدا ہوگئے اور وہ ویسما سے یورپ روانہ ہوگئے۔

عربی سوم میں اتحاد ہوا عربی دوم کی دونوں درسگاہیں جمع کردی گئیں ۲۰۰۸ء میں ساتھ فارغ ہونے والے ساتھی یہاں یکجا ہوگئے ، ستپون کے ایک محنتی طالب علم کو سب سے پہلی تپائی پر پہلے نمبر پر پایا، دوسری جانب اسلام پوری، میرجوی اور کولہاپوریوں کو کبھی سوتے کبھی سر ہلاتے پایا۔ نئے ساتھیوں کے ساتھ اتحاد و اتفاق اور کچھ شرارت لیے ہوئے یہ سال بھی پورا ہوا۔ اس سال ہم سے ہمارے دو کنجری کے ساتھی رخصت ہوگئے۔ دونوں پپودرا والوں سے ایسی دوستی ہوئی کہ بعد میں وہ تکرار کے ساتھی بھی بن گئے۔اسی سال مالیگاؤں کے مخلص رفقاء بطور خاص سلمان ونعیم اور ویسما والے خالد سے نزدیکیاں بڑھیں۔

عربی چہارم میں سہیل نامی شریف الطبع شخص کا اضافہ ہوا جنھوں نے بخوبی تعلیم حاصل کی، اس سال سمیر تاراپوری اور چکودھرا تکرار کے ساتھی اور خونچے کے باسی ہوئے۔ اور لنڈن والے الیاس جن کا وزن تھوڑا زیادہ تھا ہمیں خیر باد کہہ گئے۔ چہارم میں مولانا یوسف صاحب کاوی نے اپنے خاص وصفِ شفقت سے پڑھایا اور بزرگوں اور حدیثوں سے ایک خاص تعلق پیدا کیا۔

عربی پنجم ایک خاص امنگ اور نیا رنگ اور ایک ڈھنگ لے کر آیا، نئے نئے فنون، نئی نئی مشکل ترین کتابیں، ان کتابوں میں سے ایک حضرت چاسوی کے پاس تو دوسری مولانا الیاس صاحب کے پاس۔ان مشکلوں کے حل کا سامان بھی ہوگیا تھا حارث وحسن احمد آباد سے جلوہ افروز ہوئے اور داد صاحب سورت سے، دیر سے مل کر جلد جدا ہونے والے خوش اخلاق وخوش اطوار، چہرے پر مسکراہٹ سجانے والے یوسف بھائی بھی اسی سال متعارف ہوئے اور قدیموں سے بھی اقدم ہوگئے۔اس سال ہمارے ایک قاری آصف گھلاں نامی سالانہ انعامی جلسہ میں قراءت کرنے اور اس کے بعد نتیجۂ ناکامی ہاتھ آنے کے بعد ہم سے خفا ہوگئے۔

مشکات کا سال بڑا بابرکت رہا، پورا سال قرآن، تفسیر اور احادیث ہی پڑھنے پڑھانے میں گزرنے لگا، اسی سال ہمارے ایک درسی ساتھی کی درسی ناٹ بکس پھاڑ کر کلاس والوں پر ایک بدنامی ڈال دی گئی، حتی کہ مہتمم صاحب کو حضرت مفتی صاحب سے درخواست کرکے بیان کروانا

پڑا۔ میں نہیں جانتا کہ حضرت والا کا انداز بیان کسی اور بیان میں اتنا ڈر دلانے والا ہو۔ اس سال بھی کچھ پالنپوری حضرات ہمارے رفیق سفر ہوئے۔

عربی ہفتم کا سال ایک نئی خوشی نیا جوش و ولولہ لے کر آیا، حضرت اقدس نے حدیث مسلسل بالاولیت پڑھ کر بچوں کو سنائی، ہمیں قدیم آبائی و اجدادی برکتوں کی حامل درس گاہ سے دار السنۃ منتقل کیا گیا۔ وہاں ہم نے جام تاڑا، گودھرا، پالنپور بڑودا اور کچھ وغیرہ کے نواجوان طلباء کو دیکھا جو اپنی علم کی پیاس بجھانے یہاں تشریف لائے تھے یہ الگ بات ہے کہ یہ سب طلباء استاذ سے کم اور اس کلاس کے قدیم طلباء سے زیادہ متاثر ہوئے، سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی شخصیت اخلاق، حذیفہ، جنید تھے ان کے پاس کہانیوں کا نہ ختم ہونے والا ایک انبار ہوتا اور جابر کے اثر سے دور دور تک بیٹھنے والے جدید طلباء بھی محروم نہیں تھے۔ اسی سال ہمارے بزرگ شیخ الحدیث بقرعید کے بعد اللہ کو پیارے ہوگئے اور بھاگلپور سے مہکتا یہ گلاب ڈابھیل کی سرزمین میں مدفون ہوا، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو غریق رحمت کرے۔ اس سال داخلہ لینے والوں میں مفتی عرفان پالنپوری بھی تھے جنھوں نے اپنے نفس کو جلد کچل کر خلافت کا پروانہ بھی حاصل کیا اور فاروق بمبوی ثم پالنپوری بھی جنھوں نے اعلی نمبرات حاصل کیے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن سے صرف دعا سلام رہی کچھ ایسے بھی تھے جن سے مزاولت رہی۔

ہمارے یہ تمام ساتھی خیر و برکت والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے منتخب کردہ اور قیمتی ہیں۔

سب ۲۰۰۸ء میں اپنی اپنی منزلوں کو روانہ ہوگئے ایک مدت تک وہ عملی میدان کی بھٹی میں سلگتے رہے، نرم گرم حالات جھیلتے رہے اور دین کی خدمت میں لگے رہے۔ ان کے نطفوں سے بچوں نے جنم لیا، بیویوں والے اور ذمہ داری والے ہوگئے۔ اب ان میں بچپنا نہیں رہا، بالوں اور اعضاء رئیسہ میں بڑھاپا اتر آیا ہے۔ پھر بھی اپنے پرانوں سے ملنے کی اور غم ہائے دنیا بھول کر لڑکپن والے ایام اگرچہ ایک شام کے لیے ہو جانے کی تمنا کر رہے ہیں اور اتاولے ہیں، کوئی موسلادھار بارش میں کشمیری وادیوں کو عبور کر رہا ہے کوئی دور دراز سے سفر کرتے ہوئے ٹرین کا ایسا ہلنا برداشت کرتے کرتے آرہا ہے جس طرح بیوی کو ہلایا جاتا ہے۔ کوئی کاروبار چھوڑ کر آرہا ہے کوئی والدہ کی اجازت سے تیمارداری چھوڑ کر۔ بقیہ لوگ بھی سفر کے لیے پابرکاب ہیں اور اعذار سے برسر پیکار ہیں، بے چین اتنے ہیں کہ ان کا بس چلے واٹس اپ کی اسکرین توڑ کر ''میٹا'' کے

واسطہ سے مل بیٹھیں۔ بیوی پریشان ہے کہ موبائل میں دیکھ کر ہنس ہنس کیوں کر رہے ہیں؟

جن لوگوں کو عذر نے روک لیا ہے وہ دل سے شریک ہیں اور ساتھیوں کی خدمت اور ان کو کسی قسم کی گرانی سے محفوظ کرنے کی فکر میں گھل رہے ہیں۔کوئی ہدیہ کا نظم کر رہا ہے کوئی کھانے کا انصرام تو کوئی رات گزارنے کا۔خیر۔۔۔۔۔۔۔

اللہ تعالیٰ ساتھیوں کی اس محبت کو باقی رکھے تابندہ رکھے اور ہماری بے بسی اور عدم استعداد کے باوجود ہم سے اپنے دین کا کام لے۔اور جامعہ کے خدام اور قدر دانوں میں سے ہمیں بنائے۔

اس اجلاس کی مسرت اور بے تابی صرف ہم میں نہیں بلکہ مہتمم صاحب میں بھی نظر آئی:

حضرت مولانا رشید احمد صاحب سلوڑی رحمۃ اللہ علیہ نے مہتمم صاحب کا ایک واقعہ بیان کیا تھا کہ ایک شخص پانچ سو ہزار کی نوٹوں سے بھرا بیگ لے کر مہتمم صاحب کے پاس دفتر میں آیا مہتمم صاحب نے علیک سلیک کے بعد کہا کہ بیگ وہاں ایک طرف رکھ دیں، پھر وہ چلا گیا۔حضرت مولانا رشید احمد صاحب سلوڑی نے ہم سے کہا اگر کوئی اور مہتمم ہوتا تو ان صاحب خیر کے لیے بطور استقبال نیچے جاتا آؤ بھگت کرتا خاطر داری کرتا لیکن ہمارے یہ مہتمم بڑے خوددار ہیں۔

میں اس مرتبہ مہتمم صاحب سے ملاقات کرنے گیا تھا تو وہ پانچ سو کی گڈیاں کپڑے کے تھیلے میں اس طرح بھر رہے تھے جیسے ہم پرانے کپڑوں کو کسی گٹھری میں بھرتے ہیں اور ٹھوستے ہیں۔گویا حضرت مہتمم صاحب کے دل میں دنیا کی کوئی عظمت اور حیثیت ہی نہیں ہے۔

ملاقات کر کے جب میں باہر نکلنے لگا تو مہتمم صاحب نے کہا اکتیس اگست (اجلاس کا دن) کو آرہے ہو نا؟ اس وجہ سے کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج ۱۷/اگست کو آ گیا ہے تو ۳۱/اگست کو نہ آئے۔

اجلاس صد سالہ اور فضلاء کی ملاقاتیں

اجلاس کے بعد بعض ثقات اور صائب الرائے نے مجھے بتایا کہ الحمد للہ اجلاس کامیاب رہا، بندہ تو اپنی کم فہمی کی وجہ سے فیصلہ نہیں کرسکتا تھا البتہ ان کی بات سن کر خوشی ہوئی۔سو سالہ فضلاء کے تعداد اکتالیس سو کے قریب تھی بہت سے اس دنیا میں نہیں تھے، اور کچھ اعذار کے پابند تھے۔ باقی خوشہ چین اور وابستگان جامعہ کا جم غفیر رہا، اور ان افراد کا ہجوم لائق دید تھا۔

کسی نے صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک مسلمان کی محبت طبعی ہوتی ہے اور والد و ولد اور آل و مال سے غالب ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ مزاولت و وابستگی کی وجہ سے اس کو یہ وہم جاتا ہے کہ آل و اب کی محبت غالب ہے لیکن یہ اس کے دل پر جمی ایک گرد ہوتی ہے جو تقابل کے وقت چھوٹ جاتی ہے۔اگر کسی کا عزیز و قریب العیاذ باللہ شان رسالت میں گستاخی کرے تو قرابت کی تمام حدوں کو توڑ دیا جاتا ہے ، رشتے تعلق ایک طرف کر دیے جاتے ہیں۔بغیر کسی تشبیہ کے فضلائے جامعہ کا تعلق جامعہ سے کچھ اسی طرح کا ہے ،ان کو اس سے محبت محض رسمی اور عقلی نہیں ہے بلکہ جامعہ سے محبت ان کی طبیعت کا تقاضا ہے اور جامعہ سے محبت پر مجبور ہیں، محبت نے بڑھ کر عشق کا درجہ حاصل کرلیا ہے ۔

ہم اپنے اپنے علاقے میں جامعہ سے حاصل کردہ فیض نچھاور کرنے میں مشغول تھے، ضرورت نے ہمیں دنیا کا رخ کرنے پر بھی مجبور کر دیا تھا ، عائلی ومسؤولی ذمہ داریوں میں لگے ہوئے تھے اور جامعہ کے احسانات کے تصور کے باوجود گمان جاتا تھا کہ کہیں جامعہ سے ہمارا ربط سرسری تو نہیں کہ جو تعلیمی سلسلہ ختم ہونے پر اختتام پذیر ہوگیا۔لیکن یکایک ہمیں ایک پیغام موصول ہوتا ہے جس میں جامعہ ہمیں یعنی اپنے بچوں کو پکار رہا ہے ’’هلم الي يا ايها الفضلاء ‘‘ اے میرے جگر کے ٹکڑوں میری طرف آو۔تم کو بھی آنا ہے تم کو بھی، جوق در جوق تم لوگ آو۔

پھر کیا تھا فضلاء کے لیل و نہار بدل گئے ، چہار جانب پھیلے ہوئے فیض یافتگان جامعہ نے جامعہ کا رخ کیا ، اپنی اپنی خدمات سے اجازت چاہی ، بیوی بچوں کو الوداع کہا، کاروبار کو بھی درخور اعتناء نہ سمجھا۔عمدہ ردی سواریوں پر سوار ہوکر جامعہ کی طرف دوڑ پڑے۔ان ہی دنوں

میں جموں میں بارش نے قہر ڈھایا تھا، ٹرینیں بند ہوگئی تھیں اور کچھ راستے بھی بہہ پڑے تھے، ساتھ آنے والوں ہم راہوں سے رابطہ منقطع ہوگیا تھا وہاں کے بعض فضلاء بھی کچھ سفر پیادہ کچھ مہنگی سڑ کی سواری سے پھر دلی آ کر بذریعہ ٹرین تن تنہا پہنچے۔ اس دیوانگی کو محبت طبعی نہ کہا جائے تو کیا نام دیا جائے۔ جن فضلاء کو عذر نے روک لیا وہ اپنے عذر پر نالاں ہیں، اور دل مغموم سے اس کارواں میں شرکت کے متمنی رہے۔

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

پھر جامعہ کے چینل نے ان کے درد کا کچھ درماں کیا۔ اور دنیا کے مختلف گوشوں سے وہ شریک اجلاس رہے۔

اجلاس سے قبل والی شام کا رنگ ہی دوسرا تھا ایک طالب علم اپنے اوپر چند درجوں اور نیچے کے چند درجوں والوں سے سے واقفیت رکھتا ہے، اس کی دس سالہ فضلاء سے شناسائی ہوتی ہے۔ چناں چہ ہمیں بھی اپنے زمانے کے فضلاء صحن مسجد میں اور مسجد کی سیڑھیوں کے باہر رستوں میں اپنے ہم درسوں سے اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے نظر آئے۔ ان کی مجلسوں میں کبھی ظرافت ہوتی کبھی قہقہوں کی بارش۔ اگرچہ اب یہ نوعمر لڑکے نہیں ہیں بلکہ حوادث اور گردش زمانہ کو برداشت کیے ہوئے اڈھیر عمر کے ہیں، اب علمی میدان کے شناور نہیں بلکہ عملی میدان کے دیدہ ور ہیں۔ لیکن قدیم ساتھیوں کی ملاقات نے مجلس میں عجیب رنگ ڈالا ہے اور وہ ارد گرد کا خیال کیے بغیر بغل گیر ہو رہے ہیں اور مزاح کر رہے ہیں۔

کچھ دیر کے لیے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ۲۰ر سال پہلے والا جامعہ ہے، کہ دیکھو یہ اپنی جماعت کا ہوشیار طالب علم، یہ وہ جو کھانا تقسیم کرتا ہے یہ انجمن کا نگراں، ارے یہ وہ جو صبح فجر میں اٹھانے آتا ہے، افف یہ وہی جس سے میری چشمک ہوئی تھی، یہ ہمارے کمرے کا ساتھی اور خوانچہ کا باسی ہے۔ یہ صاحب تکرار اور یہ ہم نوالہ و ہم پیالہ۔

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

اب وہ اپنی عمروں کے چوتھی دہائی گزار رہے ہیں، ان کی ریش میں بھی شیب اتر چکا ہے اب وہ چھریرے بدن کے لڑکے نہیں بلکہ ذو البطن و البطین فربہ ڈیل ڈول والے تھے۔ اب

وہ بچے نہیں بچوں کے باپ ہو گئے ہیں۔

ہمیں اپنے اساتذہ کی اس بات کا بھی یقین ہوگیا کہ تم نہ روزی کی فکر کرو نہ شادی کی، روزی خود صاحب رزق کو تلاش کرتی ہے اور لڑکی کے جب پستان ابھر آتے ہیں تو باپ کو فکر لاحق ہوجاتی ہے کہ اس کا نکاح کرانا ہے۔ آپ لوگ علم دین کی حفاظت و اشاعت کی فکر کرو۔

ہم نے دیکھا کہ ہمارے یہ دس سالہ فضلاء (دوسرے ہزارے کے پہلے عشرے کے) کے چہرے پر رعنائی ہے، بدن پر صاف اجلے سفید کپڑے اور فربہی ہے۔ اور سب بیویاں رکھتے ہیں۔ ہم کو یہ بھی کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اہل علم کو بھوکا نہیں مارتے اگرچہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عالم بن رہا ہے تو کھائے گا کہاں سے؟ آج اللہ تعالیٰ نے ہمیں اتنا کھلا دیا ہے کہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ نہ کہہ دیا جائے: اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (تم دنیوی زندگی میں اپنے مزے لے چکے اور اس سے فائدہ اُٹھا چکے)

ہماری جماعت والوں نے ایک جگہ اکٹھا ہو کر خدمات اور ۲۰۰۸ء کے بعد کے ایام کی کارگزاری کا منصوبہ بنایا تھا، احوالِ احباب سن کر محسوس ہوا کہ ماشاءاللہ تمام ساتھی اہم دینی خدمات میں مشغول ہیں اور اس بات کا بھی علم ہوا کہ کسی بھی طرح کے حالات کو ہمیشگی نہیں ہے، مصائب آتے ہی ہیں چلے جانے کے لیے۔ اکثر احباب ابتدائی لڑکھڑاہٹ اور مشکلات کے بعد الحمد للہ اب مضبوط و مستحکم تھے۔

جامعہ کا یہ ایک اور بڑا احسان ہے کہ اس نے ہم جمیع فضلاء کو بالعموم اور دس سالہ فضلاء کو بالخصوص اور ایک سالہ دوست و احباب کو علی اخص الخصوص جمع فرمایا۔ اجلاس شروع ہوا تو ہمیں ناظم صاحب (حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ) کی ابتدائی باتوں ہی سے اپنے فاضل جامعہ ہونے پر رشک ہونے لگا۔ کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ ناظم صاحب کی وہ ابتدائی باتیں کیا تھیں تو انتظار کیجیے۔

قابل فخر اعزاز

جامعہ سے فراغت کے بعد بغرض تعلیم دار العلوم دیوبند جانا ہوا، وہاں سے مظاہر العلوم سہارنپور آنا جانا لگا رہتا، ایک آدمرتبہ ندوۃ العلماء بھی جانا ہوا۔ وہاں ہم نے دیکھا جیسے سہارنپور میں کہ فریم اور بینر لگے ہوئے ہیں جس میں ان کے بعض نامور فارغین کا مختصر تعارف ہے، کسی فاضل کی تصانیف شمار کروائی ہیں، بخاری پر ترمذی پر یہاں کیا کیا کام ہوا اور شہرۂ آفاق ہوکر مفید خاص و عام ہوچکا ہے۔ کون کون سی کتابیں یہاں سے لکھی گئیں اور چہار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ یہ سب لکھا کر آویزاں کیا گیا ہے۔ اسی طرح دیوبند اور ندوہ میں بھی اس کی طویل طویل فہرستیں ہیں کہ یہاں قرآن وتفسیر پر کیا کام ہوا، حدیث و سنت پر کیا کیا لکھا گیا، الماریاں ہی نہیں کتب خانے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہوئی ہے کہ علمائے دیوبند و سہارنپور نے آزادئ ہند کے لیے کیا قربانیاں دیں۔ جمعیت و مرکز اور مسلم پرسنل لا بورڈ اہل ہند کے لیے لائق افتخار کس نے بنایا۔

یہ سب دیکھ کر سوچتا کہ کیا جامعہ کے حصہ میں ایسا کچھ سرمایۂ فخر ہے جو اس کا تمغۂ امتیاز ہو۔ تاریخ جامعہ ہم کو پڑھنے کی توفیق ہوئی نہیں تھی، اپنے اسی احساسِ کم مائیگی میں زندگی بسر ہو رہی تھی کہ یکا یک حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی کو اجلاس صد سالہ کے اسٹیج سے فرماتے ہوئے سنا کہ اس جامعہ کے دروس حدیث کو دنیا میں جو مقبولیت ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ فیض الباری یہاں لکھی گئی۔۔ انوار الباری کو بھی یہاں ضبط تحریر میں لایا گیا۔۔ معارف السنن کی سرزمین یہی مٹی ہے۔۔ فضل الباری کو بھی یہیں کی آب و ہوا نصیب ہوئی اور موجودہ شیخ الحدیث کی تقریر بخاری بھی مقبول عام یہیں سے ہوئی ہے۔ (شیخ اکرام علی کا درس حدیث کون فراموش کرسکتا ہے، قوت بیان کی تاثیر اور دلائل کا وزن اور محاکمہ کی موزونیت کا نفع المسلم اور تحفۃ العبقری سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے اگرچہ نفع المسلم شیخ رحمہ اللہ کی ڈابھیل آنے سے پہلے کی تصنیف ہے) فوائد عثمانی بھی یہی مرقوم ہوئی، جس کی شان میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اپنی تمام ذاتی کتابیں وقف کردیں سوائے جمع الفوائد اور فوائد عثمانی کے۔

ان ابتدائی باتوں میں ہم نے بانی کا حال بھی سنا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح بانئ جامعہ

نے بھی اپنے گھر کے زیورات تک بیچ دیے۔ اور پتھر ان کو راہ خدا میں مارے گئے تھے۔ جامعہ کی بنیاد میں ان پتھروں کو بھی حصہ دیا گیا۔ایک مقالہ نگار نے اس پتھر کھانے کو طائف کی حسین یادگار سے تعبیر کیا۔ بھام صاحب روید اد میں لکھتے ہیں: امت کی جہالت دیکھ کر یہ فقیر رو رہا ہے۔اس رونے کو آنسوئے الیاس کاندھلوی کی حسین یاد گار مانا جاسکتا ہے۔

اور آزادئ ہند کی جو اگ تھی اس میں انگارے اساتذہ وطلباء جامعہ نے بھی سلگائے تھے اور اپنے پر اثر مخصوص انداز میں ناظم نے مفصلا اس واقعہ کو بیان کیا۔جس میں جامعہ کے فتوے کی تاثیر، تحریک گاندھی کی تقویت اور گاندھی جی کے اعتراف کو کھل کر بیان کیا۔ بہر حال یہ سب فخریات جان کر ہمیں اپنی مسوولیات اور احساس ذمہ داری کو بڑھانا چاہیے۔حضرت نبی کریم ﷺ خاتم النبیین تھے یہ آپ کے لیے باعث فخر بھی تھا وجہِ ذمہ داری بھی۔

تاثر دینے والے ایک صاحب نے فرمایا کہ جس طرح مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کا فیض واسطہ بلاوسطہ سارے عالم میں پھیلا ہوا ہے اور اس میں کوئی دورائے نہیں ہے لیکن یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ یورپ و امریکہ بلکہ مطلع الشّمس سے مغرب الشّمس تک اگر آپ کو فیض ملے گا تو وہ جامعہ کا یا اس کے بعد جامعہ سے فیض حاصل کرنے والے علامہ یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ کے جامعہ بنوریہ کا ملے گا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا نے یہ بالواسطہ کی تشریح کی ہے یعنی جامعہ ڈابھیل،دار العلومدیوبند کے فیض کو عام کرنے والا ایک اہم واسطہ ہے۔

ہم مفتی معاذ صاحب کے اس قول کی بھی تائید کرتے ہیں کہ ”ہم جامعہ کو دار العلوم دیوبند کی ایک ادنی شاخ سمجھتے ہیں۔“(اگر فرزندان دارالعلوم نہ ہوتے تو یہ ننھا پودا تناور نہ ہوتا، دارالعلوم تو ایک سمندر ہے موجیں ماتا ہوا۔)

الحق أحق ان یتحقق
حق ثابت ہو کر ہی رہتا ہے

﴿اجلاس صد سالہ میں ایک تاریخی مطالعہ﴾

سست طبیعتیں تاریخ کے مطالعے میں پھسڈی واقع ہوئی ہیں۔ بزرگوں کے کرامتی واقعات انہیں بھلے لگتے ہیں لیکن تاریخ ساز افراد کی تاریخ انھیں بھاتی نہیں ہے۔ حالاں کہ بات یہ ہے: ''اپنی تاریخ نہیں جانو گے تو خود کو کیسے پہچانو گے''۔میری بھی طبیعت کچھ ایسی ہی واقع ہوئی ہے، فارغ ہونے کے بعد ۱۵؍سال تک حضرت مولانا الیاس صاحب دیسائی لوہاروی دامت برکاتہم کے ''دروس التاریخ'' کے علاوہ کوئی کتاب تاریخ کی مطالعہ نہیں کرسکا تھا۔اسی طرح اپنے جامعہ کی تاریخ سے بھی میں بے خبر تھا، اس اقرار جہالت اور اعتراف ندامت کے ساتھ میں نے ارادہ کیا ہے کہ تاریخ جامعہ موکلفہ حضرت الاستاذ مفتی عبد القیوم صاحب راجکوٹی دامت برکاتہم کا مطالعہ کروں گا۔ ان شاءاللہ

البتہ سو سالہ ایک سرسری مگر کافی وافی مطالعہ ہمیں اجلاس کے محترم مقالہ نگاروں، مکرم ناظم صاحب اور نبیرۂ محدث جلیل علامہ انور کی وساطت سے ایک ہی دن میں ہوگیا۔اور حق تعالی کے اس فرمان کی حقیت کی ایک مثال ہمیں اپنوں ہی میں مل گئی: وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا. (اور کہہ دیجئے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا کہ باطل تو مٹنے ہی والا تھا) حق اپنے متعینہ وقت پر آتا ہے اور اس کے آنے پر باطل ٹھیک اسی طرح ملیامیٹ جیسے سورج طلوع ہوتا ہے تو تاریکیاں منھ چھپانے پر مجبور ہوتی ہیں۔

جس تاریخ کا ہم نے ایک دن میں مطالعہ کیا اسی کا خلاصۃ الخلاصہ اور لب لباب میں آپ لوگوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

بدعات کی تاریکیوں سے مشرقین میں ہدایات کی ضو فشانی تک

ڈابھیل و سملک پہلے بدعات وخرافات کا منبع وسرچشمہ تھے اور اطراف واکناف کے گاؤں قصبے ضلعے، جہالت کی تاریکیوں میں غرق اور رسوم ورواج میں مست تھے۔علم کی روشنی نہ ہونے

کی وجہ سے چپ کو راست سمجھنے لگے تھے۔ گمراہیوں کے خوگر اور ہدایات سے کوسوں دور۔ اکا دکا اللہ والے تھے جو روتے ہوئے یہ لکھنے پر مجبور تھے: امت کی جہالت دیکھ کر یہ فقیر رو رہا ہے۔ ۳۲/ گاؤں کا ڈابھیل گاؤں میں اجتماع ہوتا لیکن وہ اجتماع ہوتا گمراہی کا ضلالت کا عرس کا۔ اس میں اپنی جان کا مال کا ایمان و اعمال کا جنازہ نکالا جاتا۔حضرت شاہ صاحب نے سورت میں کسی مسجد میں نماز پڑھائی تو اس مسجد کو اپوتر سمجھ کر مکمل غسل دیا گیا کہ ایک بال برابر بھی سوکھا نہ رہے۔

اگرچہ بعض لوگوں کے قلوب میں خرافات کے باوجود حنفیت زندہ تھی، اس سے لگاو اور اس پر جماو تھا اگر حنفیت پر تشدد زیادہ تھا کہہ لیں تو بے جا نہ ہوگا۔ان ہی میں سے بعض کے دل دیوبند کی طرف بھی مائل تھے اور علمائے دیوبند سے ایک مستانہ تعلق تھا چناں چہ نوساری میں کسی اسٹیج پر براجمان لچھے دار مقرر نے علمائے دیوبند کے خلاف بکواس و ہفوات کے لیے منہ کھولا تو اس ہذیان گوئی کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے یہی لوگ تھے۔

ایسے ماحول میں حق کی پیش قدمی آہستہ آہستہ ہی ہونی تھی، بھام صاحب نے کچھ کر گزرنے کا ارادہ کیا، جہالت کو دور کرنے کے لیے علم کی روشنی جلانا چاہا، بدعات کو کافور کرنے کے لیے عمل صحیح کا نور پھیلانا چاہا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے قاسم العلوم والخیرات نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا اسوہ اختیار کیا، انھوں نے ایک ننھے سے مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کے مطابق اس کا مدار بھی عمومی چندہ پر رکھا۔ اس کے خاطر انھوں نے لوگوں سے پتھر بھی کھائے اور اپنے گھر کے زیورات بھی فروخت کیے اور راتوں کو اٹھ کر بے چینی میں گریہ وزاری بھی کی۔ ہدایت کا ایک چراغ تھا جو روشن کیا جاچکا تھا، علم کا ایک نور تھا جو پھیلنے کے لیے بے چین تھا، ایک چنگاری تھی جو بھڑکنے کے لیے بے تاب تھی۔علوم نبوت و وحی کا ایک چشمہ تھا جس ابال آنے کو تھا۔

احمد خضر صاحب (مہمانِ خصوصی اجلاسِ صد سالہ وسبطِ محدث جلیل کشمیریؒ) نے صحیح فرمایا کہ ”حق تعالیٰ جل مجدہ نے ہر چیز کے اندر ایک اثر و تاثیر رکھی ہے۔ کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جس کے اندر اثر اور تاثیر نہ ہو وہ نباتات ہوں جمادات ہوں اشجار ہوں اثمار ہوں ابجار ہوں انہار ہوں افراد ہوں ادارے ہوں شخصیات ہوں کوئی بھی چیز ہو کھانے پینے کے پھل سبزیاں ہوں غلے ہوں ہر چیز میں خدا تعالیٰ نے اثر رکھ دیا اور تاثیر رکھ دی اور اس کا اثر اور تاثیر رونما ہوتی ہے نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے اور اس کے اثرات نظر آتے ہیں مشاہد ہیں فنون کا بھی اثر ہے علم کی بھی تاثیر ہے۔“

اس ہدایت کے چراغ کو اسی تاثیر کی ضرورت تھی، تحریک بھام کو کسی موثر شخصیت یا شخصیات کی ضرورت تھی اور اس خطہ کے دن و رات بدلنے کے لیے کسی بڑے بدلاؤ کی ضرورت تھی کہ قدرت نے اپنا کھیل کھیلا اور ''اختلاف امتی رحمة'' کا ایک خوش نما ظہور ہوا، دارالعلوم دیوبند میں امت کی گود میں بیٹھے ہوئے چند افراد کو امت نے دائیں گود سے دوسری گود میں لے لیا۔ہجرت و نصرت کا مبارک عمل وجود میں آیا۔ انھوں نے یہاں آ کر اس خطہ کی کایا پلٹ کر رکھ دی، باطل کا سر توڑ کر ملیامیٹ کر دیا، حق کا بول بالا کر دیا، قرآن کے اس فرمان کی حقانیت کو واضح کر دیا اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا، اس ننھے پودے کو تناور کر دیا، اور اس نور کی روشنی کو سارے عالم میں عام کر دیا۔

یہ شخصیات تھیں بھی عالمی۔ ان کا ڈنکا صرف ایک گاؤں قصبے، ضلع اور ریاست تک محدود نہ تھا بلکہ انکا نغمہ سارے عالم میں سنا جاتا تھا۔لوگ دور دراز سے اس قافلے کی برکت سے اس سے استفادہ کرنے کے لیے مع اہل عیال آتے، گاؤں و اطراف میں بود و باش اختیار کرتے اور اپنے اخلاق و کردار سے یہاں کے باشندوں کو اپنا گرویدہ بناتے۔ یہاں قافلۂ انوری سے درس حدیث گونج اٹھا، قَالَ اللّٰهُ، وَقَالَ الرَّسُوْلُ کی پر اثر صدائیں فضا میں گشت کرنے لگیں۔قافلۂ انوری نے مدرسہ کے مسند حدیث کو رونق بخشنے پر ہی اکتفاء نہ کیا بلکہ مضافات میں بھی ضیاپاشی کی اور لوگوں کو خرافات و خواہشات سے بارادت الٰہی کھینچ نکالا۔ درد دل سے جو منع کیا کہ عرس دین محمدی پر ڈاکہ ہے تو لوگ رک گئے، اس وقت کے بااثر شخص نے یکا یک اعلان کر دیا کہ اب یہاں کوئی عرس نہیں ہوگا۔

حدیث میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا: الْخَيْرُ عَادَةٌ، وَالشَّرُّ لَجَاجَةٌ. (ابن ماجہ) یعنی خیر عادت ہے انسان کی فطرت کے مطابق ہے طبیعت اس کو فوراً قبول کرتی ہے اور شر غیر فطری ہے سمندر کی غیر طبعی لہروں کی طرح غیر مانوس ہے، یہ حضرات لوگوں کو سمجھاتے گئے خیر کی طرف بلاتے رہے۔ لوگ جواب دیتے رہے اور خیر کو متاع گمشدہ کی طرح قبول کرتے رہے۔

کیا خوب فرمایا احمد خضر صاحب نے: ''میں کہتا ہوں کہ اس سرزمین پر اگر ان حضرات اہل علم کی آمد خدا تعالیٰ کا ایک کرشمہ تھا تو اہل گجرات کو بھی اس کا زبردست حق پہنچتا ہے کہ ان کے بارے میں یہ کہا جائے کہ ان کے اندر طلب صادق تھی، ان کا اکرام بزرگوں کے ساتھ، ان کی محبت اہل

دین کے ساتھ اور علماء کی طرف رجحان دوسرے خطوں کے مقابلے میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔''

''معرکۂ بدر کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ نے رائے دریافت فرمائی، آپ نے فرمایا لوگوں مجھے مشورہ دو! میں کیا کروں؟ اس وقت مقداد بن الاسود کا والہانہ خطاب ابو بکر صدیق کے فدائیانہ خیالات و جذبات اور حضرت سعد کا دل افروز خطاب، سب کا خلاصہ یہی تھا کہ آج ہم جو کچھ ہیں آپ کی وجہ سے ہیں ہم غیر متمدن تھے، غیر مہذب تھے ہمیں دین کی خبر نہیں تھی اور ضلالت و گمراہی میں گرے ہوئے تھے اپ آئے ہیں اپ نے زمین بدل دی اپ نے آسمان بدل دیا، آپ نے مدینہ کی سرزمین کے اندر انقلاب برپا کر دیا۔ یہ آپ ﷺ کے اثرات تھے اسی طرح وارثین انبیاء کے بھی اثرات ہوتے ہیں۔ جہاں جہاں یہ وراثت لے کر پہنچے انھوں وہاں کی فضا کو تبدیل کر دیا، لیل و نہار بدل کر رکھ دیے۔''

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان حضرات کے قدوم میمنت لزوم، برکات و اثرات اور عبادت و مجاہدات نیز اس خطہ کے باشندگان کی دل سوزی و خدمت گزاری، اخلاص اور اہل اللہ سے وابستگی نے اس ننھے پودے کو تناور بنا دیا، جس کی جڑیں جہاں زمین میں مضبوط پھیلی ہوئی ہیں، اس کی شاخیں مشرق و مغرب میں پھل دے رہی ہیں۔ اس تناور درخت کے پھل کے بیجوں نے اب درخت اگانا شروع کر دیے ہیں۔

اب اس خطہ کا نام ''ڈابھیل'' اور خدمات نہ امریکا و برطانیہ میں غیر مانوس ہیں نہ عرب اس سے ناواقف ہیں، قافلۂ انوری نے اسے عربوں کے علمی حلقوں کے کانوں تک پہنچا دیا اور یہاں کے فرزندوں اور تاجروں نے مغرب میں اس کے نام کو طلوع و نمودار کیا۔ ناظم صاحب نے کیا خوب کہا: ''سورج نکلنے کی جگہ ہو یا وہ ممالک جہاں سورج غروب ہوتا ہو ہم نے وہاں جامعہ کے فیض کو دیکھا ہے۔''

حضرات قارئین آپ نے شر و باطل کا بہت غلغلہ سنا ہوگا، اہل باطل میں باطل پرستوں کا ولولہ دیکھا ہوگا، ان کا تقلّب تحوّل ہماری نظروں سے گزرتا ہوگا اور میرے جیسے بعض کوتاہ نگاہ سرسری نظر رکھنے والوں کو خیال آتا ہوگا ایسا ''ہوّا'' حق پرستوں کا کیوں نہیں، حق کے پرستار کی رعنائیاں کہاں ہیں؟ لیکن آپ نے اس صد سالہ تاریخ میں ماقبل اور فی الحال کے احوال کو دیکھا ہوگا اور پرکھا ہوگا، ذرا اندازہ کیجیے کہ حق کس طرح غالب آتا ہے آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ دم بدم۔

ہم نے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریکِ حق کے غالب ہونے کو پڑھا ہوگا، آپ کی تحریک میں حق اہستہ سے اٹھا اور اٹھتا ہی چلا گیا تا آں کہ چھا گیا۔ فرمان الٰہی ہے: ''بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَى الۡبَاطِلِ فَيَدۡمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ'' (بلکہ ہم تو حق بات کو باطل پر کھینچ مارتے ہیں، جو اس کا سر توڑ ڈالتا ہے، اور وہ ایک دم ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔) رحمانی صاحب فرماتے ہیں: عام طور پر جو چیز پھینکی جاتی ہے، وہ مقدار کے اعتبار سے چھوٹی ہوتی ہے، اور جس چیز پر اس کو پھینکا جائے، وہ بڑی ہوتی ہے، عجب نہیں کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ بہت سی دفعہ حق پر قائم رہنے والوں کی تعداد کم ہوگی اور باطل پرستوں کی اکثریت؛ لیکن اللہ تعالیٰ اس اقلیت کو اکثریت پر غلبہ عطا فرمائیں گے۔ ۱۲ (اس قافلہ انوری کے افراد بھی اقل تھے چند تھے لیکن چنندہ تھے۔) کیا آپ جاننا چاہتے ہیں قافلۂ انوری میں کون حضرات شام تھے کو لیجیے ناظم صاحب کی زبانی سنیے:

۱) امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ
۲) مفسر قران حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
۳) مولانا سید سراج احمد رشیدی رحمۃ اللہ علیہ
۴) مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
۵) حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ
۶) حضرت مولانا سید محمد ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ
۷) حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ
۸) حضرت مولانا محمد یحیی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
۹) حضرت مولانا سعید احمد اکبر ابادی رحمۃ اللہ علیہ
۱۰) مفتی اعظم عارف باللہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

اور اسی قافلے کے ساتھ بعد میں جڑنے والے

۱۱) حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوری رحمۃ اللہ علیہ

یہ وہ قافلہ ہے کہ جن کی امد سے یہ ادارہ ایک عظیم الشان جامعہ بن گیا اور یہ سب حضرات بڑے اونچے خاندان کے چشم و چراغ عالی النسب تھے۔

صد سالہ اجلاس کی فضلائے جامعہ کی دوسری خصوصی مجلس

﴿حضرت مولانا اسماعیل صاحب چاسوی دامت برکاتہم کے بیان کا خلاصہ﴾

یہ مجلس ہمارے لیے دو وجہوں سے اہم تھی ایک تو اس وجہ سے کہ یہ مجلس فضلائے جامعہ کے لیے خاص تھی، دوسری اس وجہ سے کہ اس میں ہمارے وہ اساتذہ ہم سے براہ راست خطاب کرنے والے تھے جن کے پاس ہم پڑھے ہیں۔ بالخصوص حضرت مولانا اسماعیل صاحب چاسوی دامت برکاتہم کہ نہ وہ بیان کرنے کے لیے کہیں تشریف لے جاتے ہیں اور نہ طلباء ہی درس میں بیٹھنے کی اجازت طلب کرنے کی جسارت کرتے ہیں، نہ آپ کا بیان یوٹیوب پر ہوتا ہے نہ کسی اور سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر۔ فارغ ہونے کے بعد یہ پہلا موقع ہوگا کہ ہم تقریر میں علامہ کے روبرو ہوں گے۔ علاوہ ازیں علامہ کو عنوان بھی ذراہٹ کر دیا گیا تھا ''عالمانہ وقار اور غیرت و خودداری'' غیرت کے کئی معنی ہوتے ہیں لیکن اس کے معا بعد خود داری لکھ کر بتا دیا کہ غیرت سے مراد خودداری ہے۔ علامہ کو دو ہی چیزوں پر کلام کرنا تھا ''وقار و خود داری'' اور آپ نے خوب کلام فرمایا بھی۔ اس عنوان نے بھی شوق کو جلا دیا تھا۔ نیز وہ اپنی ظرافتوں سے دل و دماغ میں ایک تازگی پیدا کر دیتے ہیں، مرجھائی ہوئی طبیعتوں کو کھلا دیتے ہیں۔ آپ کی شخصیت چوں کہ خود داری کا عنوان ہے، اور سکون و وقار بھی آپ کا وصف ممتاز ہے ممکن ہے مدرسہ والوں نے یہی سوچ کر یہ موضوع اپ کے لیے مختص کیا ہو۔

آپ نے بیان کے شروع میں فرمایا کہ ہم علماء میں خطاب نہیں کرتے یہ میرا پہلا موقع ہے ، علماء تو خود کامل ہوتے ہیں، ہمارے ایک استاذ مولانا آدم صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ مسلم شریف پڑھاتے تھے ، محرم کے بعد وہ رجسٹر میں ہر طالب علم کے بعد مولوی لکھتے ، میرے پوچھنے پر فرمایا کہ اب تو یہ کامل ہو گئے ہیں۔ (کامل کے سامنے کیا کلام کیا جائے) اسی وجہ سے ہم بچوں کو تو پڑھاتے ہیں لیکن فراغت کے بعد آتے ہیں تو نہ مشورہ دیتے ہیں نہ نصیحت کرتے ہیں الا یہ کہ کوئی مشورہ طلب کرلے۔ نہ ہمارے خطاب میں آپ نے یہ سنا ہوگا کہ ''معزز علمائے کرام'' ہم تو سیدھی سادھی عوامی بات کرتے ہیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ علامہ کی صرف کسر نفسی نہیں بلکہ آپ کے بیان کے عنوان کا ایک

حصہ ہے؛ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: نِعْمَ الرَّجُلُ الفَقِيهُ فِي الدِّينِ، إِنِ احْتِيجَ إِلَيْهِ نَفَعَ، وَإِنِ اسْتُغْنِيَ عَنْهُ أَغْنَى نَفْسَهُ. بہترین شخص وہ فقیہ فی الدین ہے کہ اگر اس کی ضرورت پیش ائے تو وہ نفع دے اور اگر اس سے بے نیازی برتی جائے تو وہ بھی اپنے اپ کو بے نیاز رکھے۔ (مشکاۃ:۲۵۱)

علامہ کے بیان کا خلاصہ: آپ نے فرمایا: یہاں اہم بات یہ ہے مدرسہ کے قیام کا (اور آپ حضرات کو فاضل بنانے کا مقصد کیا تھا؟) وہ دور کیا تھا جب جامعہ کی بنا رکھی گئی ؟ کیا مقاصد اس کے پیش نظر تھے؟ یہاں اس گاؤں میں ۳۲/ گاؤں کے افراد جمع ہو کر عرس کیا کرتے تھے ، (جہالت اور رسوم و دعات اور خواہش پرستی کا گھٹاٹوپ اندھیرا تھا) جہالت و بدعات کے ثبوت کے طور پر ۵۰/ سالہ قبل حضرت مولانا سعید بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کا واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا کہ گویا کل کا ہو۔

فرمایا کہ یہاں جلسہ کے موقع پر کسی شخص نے (بطور طنز یہ مزاح کے کہا ہوگا) کہ سعید کس بوٹی پر میرا نام لکھا ہے؟ اس پر مولانا سعید صاحب بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کو جلال آ گیا اور فرمایا کہ تم جس وقت تم عرس کیا کرتے تھے قریب گاؤں کے لوگ یہاں جمع ہو جاتے تھے پورا تالاب بھر جاتا تھا حتی کہ ان کے جانوروں کو بھی تم گھاس چارا ڈالتے تھے ، اب جلسہ کے موقع پر موذن دو رضائی باہر ڈال دیتا ہے، کہ یہ سوئیں گے۔ (اس واقعے سے بدعات کا اندازہ لگا سکتے ہیں)

(ان بدعات و خرافات کا سد باب جامعہ نے کیا) مقصد یہ نہیں تھا کہ آپ صلات جنازہ پڑھائیں ، اور مرغیاں ذبح کریں بلکہ ہمارا فارغ التحصیل سے مطالبہ یہ تھا کہ قوم کے اندر جو امراض جڑ پکڑ چکے ہیں دماغوں میں گڑ چکے ہیں ان باطنی امراض کا علاج کریں۔آپ لوگوں کو جاکر سمجھائیں کہ ہم کون ہیں ؟ ہمیں کیسے رہنا ہے ؟ ہم سے اللہ تعالیٰ نے کیا مطالبہ کیا ہے؟ اور ان کو بتائیں کہ ہمیں عبث پیدا نہیں کیا گیا ؟ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ.

اس مختصر تمہید کے بعد ”علامہ“ اپنے اصل موضوع پر آئے: فرمایا مجھے موضوع دیا گیا ہے ”عالمانہ وقار اور غیرت و خود داری۔“

امام نووی فرماتے ہیں: وقار خاص ہے اور سکینہ عام ہے، وقار حلم وعظمت کا نام ہے حلم کہتے

ہیں برداشت کرنا اور ضبط کرنا جو بات بھی اچھی کہی جائے اسے دل میں ضبط کرنا اور جو بری بات کہی جائے اسے برداشت کرنا۔ عدم برداشت عالم کی شان نہیں ہے۔

آگے امام نووی لکھتے ہیں: وقار ہیئت میں ہوتا ہے اور حالت ظاہرہ سے ٹپکتا ہے جیسے آنکھیں نیچے رکھنا، آواز پست کرنا۔ نرمی اور شیریں کلامی سے جو بات بنتی ہے وہ سختی میں نہیں، ہاں سختی کرنے کی کبھی ضرورت پیش آتی ہے، ہم بھی کرتے ہیں ہم بھی کھڑا کر دیتے ہیں۔

پھر آپ نے وقار (جو خود داری سے قائم رہے گا) ایک مثال ذکر فرمائی:

عمرو بن دینار، امام زہری سے روایت کرتے ہیں جب کہ عمرو، زہری سے ۱۲ سال بڑے ہیں، (اکابر بھی اصاغر سے علم لیا کرتے تھے اور ان کے فضل کا اعتراف کرتے تھے) عمرو ایک مرتبہ بیمار ہوئے اور زہری ان کے عیادت کے لیے تشریف لائے تو عمرو نے دو باتیں ان کے بارے میں کہی: ''(۱) میں نے کسی آدمی کو نہیں دیکھا جو صحیح صحیح زیادہ عمدہ طریقہ سے رفع کر رہا ہو اس کے قائل کی طرف زہری کے مقابلے میں (علماء فرماتے ہیں کہ وہ مرفوع روایتوں کا روزانہ دور کیا کرتے تھے اس لیے ان کی مرفوع روایتیں مضبوط ترین سمجھی جاتی تھیں) (۲) میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس کے نزدیک دراہم و دنانیر اتنے بے وقعت ہوں، جتنے ابن شہاب زہری کے نزدیک بے حیثیت تھے۔ آپ کے نزدیک دراہم و دنانیر کی حیثیت اونٹ کی مینگنی کی سی تھی۔''

یہاں دیکھنا یہ بھی ہے کہ کیسے ایک بڑے ایک چھوٹے کی تعریف، توصیف اور سند بیان کر رہے ہیں، اور یہ ہے امام زہری کا وقار۔

پھر علامہ اس وقار کی تشریح سورۂ فرقان کی آیات فرقانیہ سے فرمائی جس میں عباد الرحمٰن کی آٹھ صفتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ (یہی علماء کا وقار ہے)

(۱) غرور اور تکبر نہیں کرتے (۲) رات بھر عبادت میں مصروف رہتے ہیں، لہٰذا فون استعمال نہ کریں۔ (۳) ہر وقت ان کے دلوں میں اللہ کا خوف رہتا ہے۔ (۴) مال خرچ کرنے میں راہ اعتدال اختیار کرتے ہیں۔ (۵) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو پکارتے نہیں یعنی اللہ کے سوا کسی سے کارساز سمجھ کر مشکات میں مانگتے نہیں۔ اپنی حاجات و مشکلات صرف اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رکھتے ہیں۔ اگر کوئی اخلاص کے ساتھ ایسا کرے گا اللہ تعالیٰ ضرور اس کی حاجب پوری فرمائیں

گے، شرط یہ ہے اللہ تعالیٰ پر توکل ہونا چاہیے، غیروں پر نظر نہیں ہونی چاہیے۔ اور یہ ناحق قتل و بدکاری نہیں کرتے۔

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو منت سے مانگو خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو بندے ہو رب کے تو رب تعالیٰ سے مانگو

(۶) جھوٹی شہادت نہیں دیتے، بعض لوگ جھوٹ کے عادی ہوتے ہیں اس کو معلوم ہے کہ میرا جھوٹ عیاں ہے پھر بھی جھوٹ بولتا ہے۔ (۷) اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور وفکر کرتے ہیں، غیر جس طرح اپنے معبودوں پر گرتے ہیں یہ ایسا نہیں کرتے۔ (۸) یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور اپنی فیملی کے لیے دعا کرتے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ سے ہمیں ہمیشہ مربوط رہنا ہے اور اسی پر ہمیں مرنا ہے تو ان اوصاف کو اختیار کرو، ورنہ بات یہ ہے کہ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ. جس طرح مؤمن ومشرک دونوں برابر نہیں، عالم و جاہل برابر نہیں قانت (عابد) اور عاصی یکساں نہیں ہیں۔ یہ سب باتیں کون سمجھتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ (اگر آپ عقل والے ہیں تو ان کو اختیار کرو) اگر مانگنا ہے تو رب سے علم کی زیادتی مانگو۔ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا. اگر یہ باتیں ہم نے اپنالی تو وقار بھی آجائے گا خود داری بھی آجائے گی اور سب کچھ اس میں حاصل ہو جائے گا۔

آخر میں آپ نے حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے تین اشعار پڑھ کر طلباء کو دعائیہ اور ناصحانہ کلمات سے نوازا:

تنت بہ نازِ طبیبان نیاز مند مباد وجود نازکت آزردہ گزند مباد

آپ کے جسم طبیبوں کی نیاز کا نیاز مند نہ ہو (ڈاکٹروں کی ضرورت نہ پڑے) اور آپ کے نازک جسم کو کسی قسم کی چوٹ یا بیماری سے نقصان نہ پہنچے۔ (ہماری ہمارے فضلاء کے لیے یہی بھی نصیحت ہے۔)

سلامتِ ہمہ آفاق در سلامتِ تو ست بہ ہیچ عارضہ شخصِ تو درد مند مباد

تمام جہانوں کی صحت کا دارومدار آپ کی صحت پر ہے۔ آپ کا وجود کسی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔

عالِم کا فساد عالَم کا فساد ہے، امام کی نماز فاسد ہوجاتی ہے تو مقتدی کی نماز بھی جاتی رہتی ہے۔

شفا ز گفتہٗ شَکّرفشانِ حافظ جوی	کہ حاجتت بہ عِلاجِ گلاب و قند مباد

حافظ کی میٹھی نظم سے صحت و تندرستی حاصل کریں تا کہ علاج کے لیے گلقند اور عرق گلاب کی ضرورت نہ پڑے۔

ظرافتیں

علامہ کا بیان ہو اور دل لگی اور ظرافت نہ ہو!

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُمَازِحُنَا.

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے مزاح فرمایا کرتے تھے)

مزاح سے طبیعت میں ایک سرور و انبساط پیدا ہوتا پژمردگی اور افسردگی دور ہو، سستی ختم ہوکر نشاط جنم لیتی ہے اور اختلاط و افادہ آسان ہوجاتا ہے۔ظرافت آپ کی درس گاہ کی خاصیت بھی ہے، ۲۰ /۲۵ منٹ کے اس بیان میں بھی آپ نے مسکراہٹیں بکھیریں:

حضرت مولانا سعید صاحب بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کے واقعہ میں کہا کہ انھوں نے مجھے فرمایا: تو نے عرس میں کھایا ہے؟ سوال سن کر میں جھجک گیا دو تین مرتبہ پوچھنے پر میں نے کہا کہ ہاں کھایا ہے، خوب کھایا ہے۔ حفظ میں داخلہ لینے سے پہلے جب میں دس سال سے کم عمر تھا اس وقت کھایا ہے۔

مولانا سعید صاحب بزرگ نے ہاتھ مار کر مجھے ایک نصیحت بھی کر ڈالی کہ "اگر تجھے کوئی سلام کرے تو اس وجہ سے ہے کہ تو مدرسہ سے منسلک ہے۔" ہم نے اس کا خوب تجربہ کیا، چناں چہ کوئی سلام نہیں کرتا، مدرسے میں ہوتے ہیں تو سلام کرتے ہیں۔

نرمی برتنے کی نصیحت کے دوران فرمایا کہ ضرورت کے موقع پر سختی کرنی پڑتی ہے ہم بھی کرتے ہیں، ہم بھی کھڑا کر دیتے ہیں، ہمیشہ سے میرا پہلا گھنٹہ درس کا ہے جو دیر سے آتا ہے ہم اسے کھڑا کر دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہمارے طلباء نے شکایت مولانا یونس صاحب سے کر دی کہ یہ جو ہے نا دورۂ حدیث کے طلباء کو بھی کھڑا کر دیتا ہے تو انھوں نے کہا کہ اچھا! اب جب تو کھڑا کرے تو معافی

مانگنے کی۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ انھوں نے کہا تو کچھ نہیں کہے گا؟ میں نے کہا تب تو تنبیہ بے فائدہ ہو جائے گی، کھڑا ہونے والا دل میں سوچے گا اور اشارے سے کہے گا کہ ابھی تو کھڑا کر رہا ہے تو دیکھنا ابھی معافی بھی مانگے گا۔ یہ بات ان کو سمجھ میں آ گئی پھر انھوں نے کہا کہ اچھا سال کے آخر میں عاجزی سے معافی مانگ لینا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ انھوں نے کہا اس پر کچھ نہیں کہے گا؟ میں نے کہا: اس کا بھی کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ میں کھڑا کروں گا وہ سوچے گا کہ ابھی تو کھڑا کر رہا ہے سال آخر میں تو خود آئے گا اور معافی مانگے گا۔ اس پر مولانا عاجز ہو گئے۔

ہم (روزانہ کھڑا کر دیتے ہیں) اگرچہ ہم کو ایسا نہ کرنا چاہیے تھا لیکن بچوں پر نیند ایسی غالب ہے! کیا کہیں؟

مشکات شریف میں ہے نبی کریم ﷺ سے کسی نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا جنت میں نیند ہوگی؟ تو آپ ﷺ نے کچھ نہ فرمایا۔ نہ ہاں کہا نہ نا۔ بلکہ فرمایا: ''النوم اخ الموت''

اس پر بعض حضرات نے فرمایا کہ جو سوتے ہیں وہ اہل جنت میں سے نہیں ہیں۔ (بطور مزاح کہا)

یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں جنھوں نے ایسا مطلب بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

ہمارا تو ایسا ہے جو سوتا ہے ہم کھڑا کر دیتے ہیں۔

(بندہ یہ کہتا ہے: جنت میں سونا نہیں ہے ہاں سونا (ذہب) ہے اور شونا (حور) ہے۔)

صد سالہ اجلاس کی فضلائے جامعہ کی دوسری خصوصی مجلس

﴿اساتذۂ جامعہ اساطین ملت کی جامع مانع قل و دل نصائح﴾

یہ وہ مجلس تھی جس میں اپنے روحانی بچوں کو کچھ پیغامات دے کر راہ عمل بتانا تھا۔مختصر وقت میں اہم تاکیدی نصیحت کرنا تھا۔ یوں کہہ لیجیے کہ وصیت کرنا تھا کہ کیا معلوم زندگی دوبارہ ایسا موقع دے نہ دے کہ تمام فضلاء ایک مسجد کی چھت کے نیچے مجتمع مل جائیں۔جس طرح وصیت میں جو اہم ہو اسی کو ذکر کیا جاتا ہے غیر ضروری بات سے احتراز کیا جاتا ہے یہی بات ان دانشمند اساتذہ کرام کے پیش نظر تھی۔

آپ اس مجلس کے عناوین پر غور کیجیے پھر یہ عنوان کس محترم استاذ سے وابستہ کیے گئے اس پر نظر ڈالیے۔کیا آپ کو اس میں کوئی گہرائی نظر نہیں آتی؟ کیا کوئی عقل کی جوڑ توڑ سمجھ میں نہیں آتی۔کیا کوئی دانا بینا شخص جو تمام باریکیوں کا خیال رکھے ہوئے ہے کوئی اہم پیغام کوئی اعلامیہ جاری نہ کر کے وقت مغنم کو ہاتھ سے جانے دے گا؟ ہرگز نہیں! ہاں کوئی یہ تو کہہ سکتا ہے کہ یہ پیغام دینا چاہیے تھا یہ نہیں کیوں کہ یہ زیادہ اہم ہے۔وَلِلنَّاسِ فِيمَا يُعْشَقُونَ مَذَاهِبُ. آیئے ایک نظر ان عناوین کی جامعیت کی طرف مبذول کرتے ہیں جو اس مجلس میں استاذہ کرام کے سپرد کیے گئے تھے۔

ویسے تو اساتذہ جامعہ کی خدمات ہمہ جہت ہیں اور ان کا میدان عمل بھی ہمہ گیر ہے لیکن ہر ایک کسی خاص وصف سے ممتاز ہے وہی ان کا طرۂ امتیاز اور خصوصی پہچان ہے۔عناوین کی وابستگی میں اس کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

(۱) مدارس اور اس کے فضلاء کا اہم مقصد امت کے ایمان کی حفاظت ہے، ارتداد کی غلیظ مسموم ہواؤں کا قلع قمع ہے۔ چاہے وہ ارتداد ہماری بچیوں کا بھگوائیوں سے ہو یا غریبوں ناواقفوں کا شکیلیوں سے۔ اس کے لیے ایک اہم موضوع یہ رکھا گیا ”بڑھتا ہوا ارتداد لمحہ فکریہ اور طریق کار“ اور یہ عنوان حضرت الاستاذ مولانا ابو بکر صاحب پٹنی مدظلہ کے سپرد کیا گیا جو اس میدان کے شناور ہیں، اور انھوں نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات اسی میدان میں صرف کیے ہیں۔

(۲) حضرت مولانا مفتی قاضی حفظ الرحمن صاحب سمکی مدظلہ ایک علمی شخص ہیں، ان کی

ایک بڑی فکر یہ ہے کہ عالم اپنے اندر عزیمت کے اوصاف پیدا کرے، اس سلسلے میں آپ کی اہم تقاریر وتجاویز شایع ہو چکی ہیں، اسی وجہ سے ان کو یہ جامع موضوع دیا گیا: ''عالم کے لیے مطلوبہ اوصاف وخصوصیات''

(۳) بسا اوقات ایک شخص عالم بن جاتا ہے اور دستار فضیلت حاصل کر لیتا ہے لیکن وہ اپنے معاشرے سے اپنی رسم و رواج سے اور اپنے عہد جاہلیت سے نہیں نکل پاتا ہے، فارغ ہونے کے بعد جب گھر جاتا ہے تو مدرسہ کا رنگ چھوڑ وہیں کے رنگ میں رنگ جاتا ہے، ایسی حالت میں ان سے رہبری کی امید ماند پڑ جاتی ہے۔ اس بات پر توجہ مبذول کرنے کے لیے معاشرے کے بگاڑ کی رگ سے واقف، رسوم و پرم پراوں کو اپنے قدموں تلے روندنے والے استاذ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ کو ذمہ داری دی گئی اور آپ کے عنوان کا موضوع تھا ''رسم و رواج اور بے جا تبصروں سے اجتناب۔'' ایک دوسری عمومی خرابی یہ بھی ہے کہ واٹس ایپ اور دوسرے سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر طویل بے کار فضول بحث کی جاتی ہے اور وقت ضائع کیا جاتا ہے۔ اس پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

(۴) ایک عالم بسا اوقات اس بات کو لے کر پریشان ہوتا ہے کہ میری محنتیں ٹھکانے کیوں نہیں لگ رہی ہیں، اولاد پر طلباء پر یا عوام پر اس کی باتوں کا کیوں اثر نہیں ہے، اس جمعہ میں جہیز کے خلاف بیان کیا اور یہ آج پھر شادی میں جہیز کی لعنت کیوں؟ دولہا تو مجھ سے عقیدت بھی رکھتا ہے، ہدایا بھی پیش کرتا ہے۔ کیا بات ہے کہ جمعہ کے بیان پر عمل نہیں کر سکا، طلباء اس کی نصیحت کو بوجھ سمجھتے ہیں بیوی فضول لیکچر۔ وہ سوچتا ہے کہ کیا کمی رہ گئی؟ میرے اساتذہ نے کہا تھا دین کی خدمت میں لگ جانا، میں لگ گیا۔ کہا تھا کہ اہل خانہ کے لیے بھی پند ونصیحت میں حصہ رکھنا، یہ سب تو میں کر رہا ہوں!؟

در اصل یہاں کمی رہتی ہے تاثیر کی، کلام میں تاثیر، نصیحت میں اثر۔ اس کے لیے ایک مؤثر شخصیت نشانِ تواضع شب زندہ دار، عابد و زاہد استاذ کو ذمہ داری دی گئی۔ ان کا موضوع تھا۔ ''اپنی خدمات میں تاثیر کیسے پیدا کریں''

(۵) کہا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص ڈاکٹر بن جاتا ہے یا وکیل و جج بن جاتا ہے تو اس کی گفتگو میں ڈھب و ڈھال میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوتی، ہر عہدہ اپنی ایک شان رکھتا ہے

اپنا ایک وقار رکھتا ہے، وارث الانبیاء ہونا ایک بہت بڑا منصب ہے اس کے شؤون میں سے اہم ''خود داری'' ہے، اگر خود داری ضائع ہوگئی تو وقار اور عالمانہ شان کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا۔ اپنے ایک استاذ سے کسی بزرگ کے حوالے سے سنا تھا کہ مالدار کے ارد گرد طالب مال علماء کچھ ایسے لگتے ہیں جیسے گو پر بھنبھناتی مکھیاں۔ اگر کسی کو مالداروں کی حاشیہ برداری کی عادت ہو جائے اور وہ ان کا حالی موالی ہو جائے تو دنیا چاہے ملے نہ ملے وہ دین کو برباد کر بیٹھتا ہے۔ میں نے اپنے تمام اساتذہ کو اس سلسلے میں بہت محتاط دیکھا ہے۔ لیکن خود داری جن کی پہچان ہے، وقار جن کا علَم ہے وہ حضرت مولانا اسماعیل صاحب چاسوی دامت برکاتہم کی ذات گرامی ہے، ان کو موضوع دیا گیا ''عالمانہ وقار اور غیرت مندی و خود داری'' خود داری کا معنی ہے خود کو رکھنا یعنی اپنی حیثیت برقرار رکھنا، اور اس پر حضرت والا نے خوب روشنی ڈالی تھی جس کو میں مستقل الگ تحریر میں لکھ چکا ہوں۔

(٦) ''علمائے امت کی ذمہ داریاں'' یہ ایک ایسا جامع ترین عنوان ہے جو جامع اوصاف ہستی کے لائق تھا جس نے اپنی زندگی امت کے تئیں اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے کرتے خرچ کر دی ہو، جس نے اپنی جوانی امت کو گھوٹ کر پلادی ہو، جس نے اپنی راتیں اپنے اوقات اپنی جلوتیں وخلوتیں امت کے نام وقف کر دی ہوں، امت کے ہر طبقہ سے اس کا ربطہ ہو اور ان کی ضروریات سے واقف ہو۔ ایسی شخصیت ہر ادارہ کو میسر نہیں آیا کرتی ہے لہٰذا اس عنوان کو سپرد کیا گیا محبوب علماء والصلحاء سیدی وسندی حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کو۔ آپ کی تقریر مقالے کی شکل میں تھی جو بعد میں شاید شائع کی جائے۔

آیئے ہم بطریق لف نشر غیر مرتب ہر ایک کی تقریر کا مختصر خلاصہ ملاحظہ کرتے ہیں: اس خلاصہ میں تقریر کے اہم نکات کو نمبر وار لکھا جائے گا تا کہ یاد رہے، ظاہر ہے اس سے تقریر کی روح ختم ہو جائے گی لیکن ہم بغرض اختصار اس پر مجبور ہیں، مکمل تقریر کے لیے اس کی تاثیر اور روح کے ساتھ آپ جامعہ کے یوٹیوب چینل سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

محبوب علماء والصلحاء سیدی وسندی حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

عنوان: علمائے امت کی ذمہ داریاں۔

دین اللہ احکم الحاکمین کے اوامر و نواہی اور احکام و فرامین کے اُس مجموعے کا نام ہے جو

حضرات انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے ذریعے بندوں کے پاس بھیجا جاتا ہے؛ لہٰذا دین و مذہب کی حقیقت متعین کر کے اس پر عمل کرنے کی صورت معلوم کرنے کے لیے حضرات انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں اور مقاصد بعثت کا سامنے ہونا ضروری ہے، جس سے اُن کے جانشینوں کی اصل ذمہ داری معلوم ہوگی۔ اسلام میں جانشینی کسی منصبِ افتخار کا نام نہیں؛ بلکہ یہ ایک ذمہ داری اور مسئولیت کا نام ہے؛ اس لیے جو شخص انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے مقاصدِ بعثت اور وظائفِ حیات کو سامنے رکھتے ہوئے اصولِ صحیحہ کے مطابق دین کی خدمت انجام دے گا، وہ وارث انبیاء کہلائے گا۔

پھر آپ نے چار آیتوں کے پیش نظر دس وظائف انبیاء اور مقاصد بعثت شمار کرائے۔

۱. اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ.

۲. یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ.

۳. یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ .

۴. یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ.

۱- دعوت الی اللہ ۲- تلاوتِ آیات ۳-تعلیمِ کتاب وحکمت ۴- تزکیۂ نفوس وتربیتِ اخلاق ۵-علمی مباحثہ ومناظرہ ۶- امر بالمعروف ۷- نہی عن المنکر ۸- حلت وحرمت کے مسائل کی تبیین ۹- رسوم وبدعات کی بیخ کنی ۱۰- احکامِ دین کی تبلیغ۔

''اصرھم'' پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ رسوم و رواج امت پر ایک بڑا بوجھ ہے۔ اولاً خود ان سے دور رہیں اور دوسرے کو دور رہنے کی تاکید کریں، آپ لوگوں کی محنت کا اہم محور یہ ہونا چاہیے، انھوں نے سنت کی جگہ لے لی ہیں۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ الحمد للہ قدیم طرز کے مدارس اسلامیہ کا نصاب و نظام بہ حیثیت مجموعی اس محورِ فکر پر مبنی ہے، جس میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابوں کے ذریعے موت سے لے کر حیات تک، طہارت سے لے کر میراث تک، اور ذاتیات سے لے کر اجتماعیات تک کے سارے احکامِ دین پڑھے پڑھائے، اور دوسروں تک پہنچائے جاتے ہیں، اور امت کی دینی ہدایت

و رہنمائی کے تعلق سے جو کچھ رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے سب کی تبلیغ کی جاتی ہے۔
پھر آپ نے تلمیذ محدث انور حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہما کی نصائح پڑھ کر سنائیں جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو فرمائی تھیں۔ مختصرا پیش خدمت ہیں:

۱) وقت ضائع نہ کرنا، مجھے اس سے بہت زیادہ فائدہ ہوا، بہت کام کرنے کا موقعہ ملا۔
۲) اکثروا ذکر ھازم اللذات الموت گناہ چھوڑنے کی ایک اہم تدبیر یہی ہے۔
۳) ہر وقت چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کوئی نہ کوئی ذکر یا تلاوت میں رہیں۔
۴) حبِ جاہ و حبِ مال سے دور رہیں یہ دو خوں خار بھیڑیے ہیں۔
۵) اصلاحِ باطن اور تہذیبِ اخلاق کے لیے شیخ کامل سے بیعت کر کے اخلاق سوارنے کی پوری کوشش کریں۔
۶) ہر وقت یہ حدیث پیش نظر رکھیں کہ سب سے اونچا مقام احسان ہے۔ أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ.
۷) اللہ نے ہمیں مسلک اہل حق عطا فرمایا اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، اس کا شکر ادا کریں: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ.
اس کا طریقہ: اساتذہ و اکابر سے تعلق قائم رکھیں۔ پیوست رہ شجر سے امید بہار رکھ۔
۸) فارغ ہو کر کسی نہ کسی دینی کام میں لگ جائیں.

سنتوں کے اہتمام کی ایک بار پھر تاکید فرمائی اور اس کے فائدے شمار کرائے:

۱) اَلْمَحَبَّةُ فِي قُلُوبِ الْبَرَرَةِ — نیک لوگوں کے دلوں میں محبت
۲) الْهَيْبَةُ فِي قُلُوبِ الْفَجَرَةِ — برے اور فاجر لوگوں کے دلوں میں ہیبت
۳) السَّعَةُ فِي الرِّزْقِ — رزق میں وسعت
٤) وَالثِّقَةُ فِي الدِّينِ. — دین میں پختگی
۵) محبت الٰہی: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللهُ.
یعنی اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔
یہی اتباع سنت ہمارے اکابر کا شیوہ ہے۔

حضرت الاستاذ مفتی عباس صاحب بسم اللہ دامت برکاتہم

عنوان: اپنی خدمات میں تاثیر کیسے پیدا کریں

ابتدائی باتیں: آپ حضرات کو علم سے آراستہ کر کے یہاں سے روانہ کیا گیا۔۔۔ آپ گھر پہنچے آپ کا اعزاز ہوا۔۔۔ کہ عالم بن کر آئے ہیں۔۔۔ آپ لوگ کسی نہ کسی دینی خدمات میں لگے ہیں۔۔۔ وقت کو قیمتی بنا رہے ہیں۔۔۔ پڑھنے کے بعد نشر و اشاعت کا مل جانا انتخاب الٰہی ہے۔

آمدم برسر مطلب: اہم بات یہ ہے کہ ہماری خدمات میں جان پیدا ہو جائے۔ اس کے لیے؛

۱) اکابر کی سوانح پڑھی جائیں، کہ موجودہ زمانہ میں انھوں نے کس امانت کو پہنچایا اور وہ کس طرح دل پر اثر انداز ہوئیں۔

۲) احیائے لیل کیا جائے۔ رات کو نماز قرات اور ذکر سے آباد رکھا جائے۔ فترت وحی کے بعد نبی کریم ﷺ کو سب سے پہلی وحی میں قیام اللیل ہی کا حکم تھا اور آپ اس طرح قیام فرماتے کہ ورم ہو جاتا۔ صحابہ کا بھی وصف امتیاز یہی تھا "فُرْسَانُ النَّهَارِ وَرُهْبَانُ اللَّيْلِ"۔ امام اعظم بھی طویل قیام اللیل فرماتے۔ فرمایا: خدمات میں تاثیر قیام سے آئے گی۔

۳) تلاوت کلام اور عمل بر کلام۔ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا. (القرآن) إِنَّ اللهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ (الحدیث) علامہ عثمانی رحمہ اللہ کی درس صحیح بخاری میں امام اعظم رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے زندگی بھر میں ۴۰ ہزار قرآن ختم فرمائے تھے۔

۴) بکثرت ذکر: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللهَ ذِكْرًا كَثِيرًا. اگر اس کا اہتمام کرو گے تو دیکھو آپ کی باتوں میں کیسا اثر آتا ہے، شاگرد آپ کی باتوں کو قبول کریں گے، عوام آپ کی باتوں سے اثر لیں گے۔ فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ باوجود مکمل دورۂ حدیث خود پڑھانے کے روزانہ سوا لاکھ مرتبہ اسم جلالہ کا ورد فرماتے۔ عقل محو حیران ہے۔

۵) دعا کا اہتمام: وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا. علم کسبی بھی ہوتا ہے اور وہبی بھی۔ دونوں مانگیں۔

۶) كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ: حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہما اللہ باوجود یہ کہ علم میں بڑے تھے لیکن اصلاح باطن اور احسان کے لیے انھوں نے صادقین میں سے حاجی صاحب کی مصاحبت اختیار کی۔

حضرت الاستاذ مفتی محمود صاحب بارد ولی مد ظلہ

عنوان: رسم و رواج اور بے جا تبصروں سے اجتناب

۱) شادی منگنی موت میت وغیرہ سنت کے مطابق کریں رسم و رواج سے پاک زندگی گزاریں۔ ایسے بھی واقعات ہیں کہ ہمارے فاضل شادی کے موقع پر گھوڑی کا انتظام طلب کرتے ہیں! کیا آپ لوگوں نے یہاں کسی اساتذہ کے وہاں ایسے رسوم دیکھے ہیں؟ نبی کریم ﷺ کا ولیمہ نہایت سادگی سے ثابت ہے۔

۲) انٹرنیٹ پر بے جا تبصرے سے احتراز کریں۔ بالخصوص ایسے تبصرے جس میں کسی عالم دین کی ذات کو نشانہ بنایا گیا ہو۔ عالم کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کی حفاظت کرتا ہے۔

۳) ہفتہ واری درسِ قرآن و حدیث سے مسجدوں کو آباد کریں۔

۴) تعلیم الدین ڈابھیل کا مقصد یہ بھی تھا کہ امت تک مکاتب کے ذریعہ رسائی حاصل کی جائے۔ اسلامی مکاتب قرآنیہ ایمان و اسلام کے بچانے کا ذریعہ ہیں۔ ایسے حضرات گجرات میں ہیں جنھوں نے ۶۵ سال ہو گئے قرآن کا لفظ نہیں سنا، ہیں مسلمان نام ہندوانہ ہے۔

۵) کچھ نہ کچھ پڑھاؤ، بہت افسوس ہوتا ہے کہ فاضل جامعہ ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پورے طور پر تجارت میں لگ گیا ہوں۔

۶) دین کے عنوان سے کوئی بھی نئی بات جو اسلاف کے نہج سے ہٹ کر ہو تو اپنے اساتذہ کا عندیہ معلوم کریں۔

۷) دار العلوم دیوبند والا مسلک وعقیدہ ہمارا ہے وہاں کی باتیں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں، ہم دار العلوم کی شاخ ہیں۔

حضرت الاستاذ مفتی حفظ الرحمن صاحب سمکلی مد ظلہ

عنوان: عالم کے لیے مطلوبہ اوصاف وخصوصیات

۱) آپ نے فرمایا علم میں رسوخ مطلوب ہے سطحی علم ناکافی ہے۔ ”صاحب علم“ لفظ ہی بتا رہا ہے کہ وہ علم سے لبالب لبریز ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں تو وہ کامیاب خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ ایک عالم جب لوگوں کو تسکین نہیں دے سکتا تو لوگ دوسرے تیسرے پلیٹ فارم پر جاتے ہیں۔

۲) صاحب علم نصوص کی روشنی میں اپنی ذمہ داریاں اور اوصاف جانیں۔نصوص سے معلوم ہوگا کہ آگے کیا احوال آسکتے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

۳) نیٹ اور موبائل سے اجتناب: ان دونوں نے جہاں اور خرابیاں پیدا کی ہیں مطالعہ کی یکسوئی اور گیرائی و گہرائی کو غرق کر دیا ہے۔

۴) صرف علم کی منتقلی کا نام تدریس نہیں بلکہ معاشرے میں اتری ہوئی برائیوں کا قلع قمع کرنا بھی ضروری ہے، یہ ضروری ہے کہ سیکھیں سامنے والے آدمی کو کس طرح ٹریٹ کرنا ہے۔

۵) روحانیت پیدا کی جائے: اللہ تعالیٰ نے روحانی اور قلبی کیفیت کو ''علم'' اور ''صاحب علم'' کے ساتھ ساتھ بیان کیا ہے۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ. (سورۂ آل عمران: ۷) راسخین علم کے ساتھ قلبی زیغ کو ذکر کیا گیا۔ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا. (سورۂ فاطر: ۲۸) اس میں خشیت جو دلی کیفیت کا نام ہے یہ علماء کے ساتھ مذکور ہے۔ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآىِٕمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ یَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ. (سورۂ زمر: ۹) اس میں بھی علم اور اہل علم کے ساتھ ''حذر و رجا'' مذکور ہے جو دلی کیفیات کا نام ہے۔معلوم یہ ہوا علم کے ساتھ روحانیت اور دلی کیفیت پیدا کرنا چاہیے۔مختصر سے کلمات اگر دل سے کہیں جائیں تو اثر کرتے ہیں۔

۶) اب علماء کے آرام کرنے کا وقت نہیں ہے وقت نکالیں اور ارتداد کے سیلاب پر بند باندھیں اب صرف شکایات کر کے کام نہیں ہوگا۔نجی ضرورتیں دوسرے نمبر کی چیزیں ہیں۔

۷) خواتین میں ارتداد زیادہ ہے تو بتائیں ہماری ان میں کیا محنت ہے؟ جس پودے کو پانی نہ پلایا جائے وہ سوکھ جاتا ہے۔

حضرت الاستاذ مفتی ابو بکر صاحب پٹنی مدظلہ

عنوان: بڑھتا ہوا ارتداد لمحہ فکریہ اور طریق کار

۱) رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے پہلے جو فتنہ اٹھا وہ بھی فتنۂ ارتداد تھا ''وَكَفَرَ مَنْ

كَفَرَ مِنَ الْعَرَبِ'' اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو حوصلہ، جرأت مندی اور استقامت کا مظاہرہ فرمایا وہی ہمارے لیے مشعل راہ ہے نیز ان کا یہ فرمان: أَيَنْقُصُ الدِّينَ وَأَنَا حَيٌّ.

سیرت صدیق کا سبق: ۱)افہام وتفہیم۔ ۲)ضروت پڑنے پر مزاحمت۔ ۳)اس سلسلے میں آخری سے آخری تدبیر بھی اختیار کی جاسکتی ہے۔ ۴) توکل و استقلال مزاجی۔

۲) دور فاروقی میں دور دراز مقامات تک اسلام پھیل گیا۔ آپ ارتداد کے بارے میں کتنے حساس تھے! آپ نے فرمایا: مسلمانوں اور کافروں کے محلے اتنے دور ہوں کہ آگ نظر نہ آئے۔

سبق: کافروں سے اختلاط، میل جول اور دوستانہ نہ رکھا جائے یہ ارتداد کا اہم سبب ہے۔

۳) خلافت راشدہ کا دور ختم ہوا، سبائیت نے سر اٹھایا، بنو امیہ کے زمانہ میں معتزلہ اور عقل پرستوں کا فتنہ اٹھا، اشعری غزالی پیدا ہوئے، علم سے آراستہ ہو کر انھیں کی زبان میں جواب دیا۔

۴) پھر سات صدیوں بعد استشراق کا حملہ ہوا، استشراق کا آسان معنی ''مسلمانوں کی کتابیں عیوب تلاش کرنے کے لیے پڑھنا''۔ آر ایس ایس کی جانب سے ایک کتاب چھپی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قافلہ سفر سے واپسی میں رات مدینہ منورہ سے باہر کیوں گزارتا تھا اس کی وجہ لکھتے ہیں ''تا کہ جو عورتیں مردوں کے سفر میں جانے کی وجہ سے زنا کاریوں میں مبتلا ہو جاتی تھیں وہ باز آجائیں۔'' حالاں کہ حدیث میں اصل حکمت استحداد اور تہذیب الشعر بتائی گئی ہے۔

۵) پچھلی تین صدیوں سے استشراقیت اور استعماریت پوری پلاننگ کے ساتھ مرتد کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

۶) چہ باید کرد: اگر میرے مخاطب مالدار ہوتے تو میں کچھ اور کہتا اگر عسکری قیادت ہوتی تو میری گزارش کچھ اور ہوتی ''تم! تم تو علم کو پھیلاؤ زیادہ سے زیادہ'' ارتداد کا ایک سبب جہالت ہے علم کی روشنی پھیلا دی تو چاہے بھوک ہو غربت ہو لیکن وہ ایمان نہیں چھوڑیں گے غزہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

۷) علم کی روشنی کیسے پھیلائی جائے اولین ترجیح اسکولی لوگ ہوں۔ ان میں کتاب کی جانب رہبری کی جائے علوم و فنون پڑھائے جائیں نصابِ تعلیم مقرر کیا جائے یک سالہ کورس رکھا جائے جامعات کا نظام کیا جائے درسِ عقیدہ خاص طور پر کیا جائے۔

اجلاس صد سالہ میں آئے ہوئے سبق آموز واقعات

اجلاس ہی میں مولانا رحمۃ اللہ صاحب نے جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ نقل فرمایا تھا: حکایات قلوب کا لشکر ہیں۔ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ. (سورۂ ہود:۱۲۰) علماء اور بزرگوں کے واقعات سے ان کی عظمت و محبت بڑھتی ہے جس سے ان کی اتباع آسان ہو جاتی ہے، ایک روحانی سکون ملتا ہے، نمونۂ عمل سامنے آتا ہے، ایمان میں اضافہ ہو کر عمل کی ترغیب ملتی ہے، دینی بصیرت، اخلاقی تربیت اور مشکلات پر صبر و تسلی یہ سب ہم ان واقعات سے سیکھتے ہیں۔ لہٰذا مناسب سمجھا کہ اجلاس میں ذکر کردہ واقعات حسین پیرائے میں پیش کیے جائیں ان واقعات سے احتراز کرتے ہوئے جو کسی مضمون میں آچکے ہیں۔

محدث انور کی شان: مولانا رحمۃ اللہ صاحب نے فرمایا: ہم مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مسلم شریف پڑھتے تھے، جب آخری سبق باقی رہ گیا تو انھوں نے ہمیں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیج دیا کہ آخری سبق آپ پڑھائیں۔ ترجمان دیوبند مہتمم صاحب نے اس وقت ایک نجی مجلس میں اپنے استاذ شیخ محدث انور رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا کہ جب ''شاہ صاحب'' تشریف لاتے تھے تو ''ترجمان'' دورۂ حدیث کے دالان سے بالکل ایسا اعلان کرتا تھا جیسا بادشاہ کی آمد پر کیا جاتا ہے۔ ''جَاءَ الشَّيْخُ الثِّقَةُ الْأَمِينُ'' اور مہتمم صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی مسئلہ ذو جہتیں ہوتا یا کوئی حدیث محتمل ہوتی تو ہم آپ کے عمل کو دیکھ کر احتمال متعین کرتے۔

شاہ صاحب کا تقوی و تواضع اور احسان سپاسی: اتنے بڑے محدث ہیں اس کے باوجود آپ کسی مسجد میں بے تکلف نماز پڑھانے کھڑے ہو جاتے اور باوجود اس کے کہ آپ اردو میں زیادہ قادر الکلام نہ تھے، نماز کے بعد ازخود اعلان فرماتے کہ انور کچھ حدیث پیش کرنا چاہتا ہے اور پھر مختصر بیان فرماتے۔ ایک مرتبہ فرمایا: یہ علاقے والے (ڈابھیل و مضافات) ہمارے کام آئے ہیں، ہماری خدمات کی ہیں ہمارا بھی ان پر حق بنتا ہے۔

تنخواہ میں احتیاط: ایک مرتبہ جامعہ کے کام سے رنگون جانا ہوا ویسے تو ایک گھنٹے کا سبق چھوڑنا بھی ان حضرات پر گراں تھا لیکن مدرسہ کی ضرورت کی وجہ سے جانا پڑا وہاں مدرسہ کا

کام بھی اچھا ہوا۔ واپسی پر حضرت شاہ صاحب نے لکھ دیا کہ ان ایام کی بندہ تنخواہ نہیں لے گا کیوں کہ ہم رخصت لے کر گئے تھے اور مدرسہ میں حاضر نہیں تھے۔ مہتمم صاحب نے عرض بھی کیا کہ حضرت اس سفر میں مدرسہ کا کام بھی کافی ہوا ہے۔ لیکن شاہ صاحب نے ان دنوں کا معاوضہ قبول نہ فرمایا۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بے نفسی: مفتی صاحب انتہائی منکسر المزاج اور متواضع طبیعت رکھتے تھے اور بالکل اس دعا کا مصداق تھے اَللّٰھُمَّ أَحْیِنِیْ مُسْکِیْنًا وَأَمِتْنِیْ مُسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ.

ایک مرتبہ آپ کی زوجہ محترمہ عرض نے کیا: برسات آنے والی ہے بارش کا موسم آنے والا ہے، کسی مزدور کو بلایئے اور چھت پر مٹی رکھوایئے، ایسا نہ ہو کہ بارش کی شدت سے چھت ٹپکنا شروع ہو جائے۔ مفتی صاحب کسی کو لائے اور اس کو مٹی ڈالنے کے لیے اوپر بھیج دیا اور خود بھی کچھ دیر کے بعد اوپر تشریف لے گئے فرماتی تھیں اہلیہ ! کہ کافی وقت گزر گیا نہ وہ مزدور نیچے اترا نہ مفتی صاحب نیچے اترے۔ نیچے سے آواز دی تو کوئی جواب نہیں آیا کہتی تھیں : کہ نقاب لگا کر۔ میں اوپر سیڑھی پر چڑھی تو عجیب غریب منظر دیکھا؛ مفتی صاحب نے اپنے کاندھے کا رومال زمین پر بچھایا ہوا ہے چھت پر اور اس مزدور کو لٹا کر اس کی ٹانگیں دبا رہے ہیں زوجہ محترمہ نے اپنے قدیم طرز و انداز میں سر پیٹ لیا اور کہا تم نے تو ناک کٹوا دی یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا طریقہ کار ہے وہ مزدور ہے اور اس کو مزدوری کے لیے لائے ہو! اس کی خدمت لینے کے لیے بلکہ تم تو اس کے خادم بن گئے! کہا کہ وہ تھک گئے تھے، ہم نے سوچا کہ کچھ ان کی خدمت ہو جائے، کچھ ان کی تھکان دور ہو جائے۔ اس طرز کے بے نفس انسان ڈابھیل کی سرزمین پر رونق افروز ہوئے ہیں۔

مفتی صاحب ایک نعش تھے جو زمین پر چل رہے تھے: حضرت مولانا احمد خضر صاحب فرماتے ہیں : میرے والد مرحوم فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری لکھتے ہیں اپنی شہرہ آفاق کتاب لالہ و گل کے اندر ! کہ مفتی صاحب اللہ کے ایک عجیب و غریب نظام کے تحت ایک عجیب و غریب شخصیت تھی۔ حضرت مولانا عبد اللہ خان صاحب جو نقشبندیت کے امام تھے اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی کے شاگرد اور دار العلوم دیوبند کے فاضل۔ وہ

ایک سال مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر تشریف لائے، میرے والد بھی ان سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ لکھتے ہیں کہ میں نے حضرت مولانا عبداللہ خان صاحب سے دریافت کیا کہ حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ حضرت مولانا عبداللہ خان صاحب نے فرمایا: **کالمیت**، کہ وہ تو زمین کے اوپر چلنے پھرنے والی ایک میت تھی ایک مردہ تھا یعنی نفس کا نام و نشان نہیں تھا بے نفسی تھی اور بے رغبتی تھی دنیا کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی۔

مفتی صاحب کا دنیوی آرام سے رشتہ بقدر ضرورت تھا: مولانا قاری محمد طیب صاحب کے خسر مولانا محمود صاحب رامپوری کا بیان ہے کہ زمانہ طالب علمی میں مفتی صاحب کی مسجد میں رہتا، دیکھا کہ مفتی صاحب کا قیام مسجد کے ایک حجرہ میں ہے اور آپ ہمیشہ پاؤں کو پیٹ سے ملا کر سوتے ہیں، کبھی پاؤں دراز نہیں کرتے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت پاؤں لمبے کر کے سویا کیجیے۔ فرمایا کہ میاں محمود! دنیا آرام کی جگہ نہیں ہے، پاؤں پھیلا کر تو قبر میں سوئیں گے۔

حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام: علامہ خضر کشمیری فرماتے ہیں: حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کیا شخصیت تھیں! میں سمجھتا ہوں کہ علوم قاسمی کو جماعت دیوبند میں سے جتنا جذب حضرت مفتی شبیر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا پوری جماعت کے اندر ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کے بعد قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کا علم فتح الملہم میں نظر آئے گا، فوائد قران میں نظر آئے گا میرے والد جنہوں نے متعدد تفاسیر کے اوپر کام کیا ہے، ان کو ان فوائد سے خاص مناسبت تھی، فرماتے تھے کہ علامہ عثمانی کے فوائد کی قدر و قیمت اور اس کا صحیح اندازہ وہ کر سکے گا جس کی نظر پورے ذخیرہ تفسیر کے اوپر ہو علامہ نے تمام ۱۴۰۰ سال کے تفسیری ذخیرہ کو کھنگال کر رکھ دیا اور اس کے عطر کو اور خلاصے کو پیش کر دیا۔

کس شان کے عالم ہیں؟ ان کا علم اگر دیکھنا ہو تو آپ کو فضل الباری ان کی تقریر بخاری میں نظر آئے گا۔ کیا شان کی خطابت تھی ان کو اللہ تعالیٰ نے وہ طلاقت لسانی عطا فرمائی تھی ایسی سحر البیانی عطا فرمائی تھی کہ انھوں نے اپنی زبان کی بنیاد پر کئی مرتبہ غیر منقسم ہندوستان میں معرکہ سر کیے ہیں اور جھنڈے گاڑے ہیں۔

علامہ کشمیری پر مہربان دو بجنوری خاندان: علامہ خضر فرماتے ہیں: بجنور کے دو خاندان عظیم الشان، ایک حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوری ایک حضرت مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری

(جن کے حفید یہاں پر موجود ہیں حضرت مولانا انوار الرحمن صاحب رکن شوری دار العلوم دیوبند میرے رفیق اور میرے نہایت ہی کرم فرما) ان کے دادا محترم انھوں نے اپنی رفاقت وتعلق کو حضرت علامہ کشمیری سے اس طرح نبھایا کہ علامہ کشمیری ابھی علامہ نہیں ہوئے تھے دار العلوم دیوبند کے طالب علم تھے اور حضرت مولانا مشیت اللہ صاحب رفیق درس ہیں۔ دیوبند کی مسجد میں (محلہ پٹھان پورہ) میں امامت کرتے اور وہاں کا سقایہ بجنور کا یہ رئیس ایک کریم اور نہایت ہی عظیم الشان خاندان کا فردِ فرید طالب علم علامہ کشمیری کی رفاقت کا حق اس طرح ادا کرتا کہ وہاں پر سقایہ بھرتے اور علامہ کشمیری کے ذمہ داریوں میں اپنا ہاتھ بٹاتے۔ دار العلوم تک کے پیدل سفر میں حضرت مولانا مشیت اللہ صاحب ساتھ ہوتے علامہ کشمیری ان کو سدرہ کبھی ہیئت کبھی آسمان پر موجود کواکب اور ان کی تشخیص وتعیین کرتے ہوئے درس دیتے ہوئے چلتے اور علامہ کشمیری نے جن خاندانوں کا ہندوستان میں ذکر فرمایا وفادار خاندان کے طور پر کہ ہندوستان میں آکر ہمیں چند خاندان ملے ہیں جو انتہا سے زیادہ وفادار ہیں بلکہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ علامہ کشمیری فرماتے تھے میری دادی سے (اپنی اہلیہ سے) کہ ہمارے بعد ان خاندانوں میں چلی جانا بچوں کو لے کر، وہ ان کی پرورش کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی پرورش میں دستکش نہیں ہوں گے۔ ان میں سے ایک حضرت مولانا بھی ہیں۔

وائرل تصویر کی تردید: ان کے فرزند دار العلوم دیوبند کے مہتمم سابق حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ایک موقع پر علامہ کشمیری کی تصویر وائرل ہوئی، مختلف ذرائع ابلاغ پر تو والد مرحوم نے مولانا سید نسیم اختر شاہ صاحب قیصر کو وہ تصویر لے کر حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب نور اللہ مرقدہ کے پاس بھیجا، دار العلوم دیوبند کے اہتمام میں کہ جا کر تصدیق کراؤ۔ جو حضرت علامہ کشمیری کو دیکھنے والے اور زیارت کرنے والے تھے انھوں نے انکار فرمادیا کہ یہ علامہ کشمیری کی تصویر نہیں ہے۔ آج کے اس اجلاس کی مناسبت سے ایک تصویر وائرل ہے تمام کے تمام میڈیا پر وہ وہی تصویر ہے جس کی تردید حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب کر چکے ہیں۔

حضرت مولانا احمد رضا صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ: جس طرح علامہ عثمانی نے حضرت نانوتوی کے علوم کو جذب کیا حضرت علامہ کشمیری کے علوم کے جذاب شخصیت حضرت مولانا محمد یوسف بنوری اور حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوری ہیں یہاں تک لکھتے ہیں مولانا احمد رضا بجنوری کہ

فلاں بات کہہ کر فلاں جملہ کہہ کر درس میں حضرت شاہ صاحب مسکرائے تبسم فرمایا یا ضحک فرمایا اور حضرت کے کتنے دندان مبارک نمایاں ہوئے۔ اتنا ضبط کیا ہے حضرت علامہ کشمیری کی تقریر کو۔ فرماتے تھے کہ جس وقت کسی حدیث پر علامہ کشمیری حوالے دینے پر آتے ہیں اور فرماتے کہ ابن حجر نے یہ لکھا عینی نے یہ لکھا اور کرمانی یہ کہتے ہیں کہ قسطلانی یہ کہتے ہیں عز الدین ابن ابی السلام نے یہ کہا فخر رازی یہ کہتے ہیں فرماتے تھے کہ اس وقت میں اپنا قلم رکھ دیتا تھا ہماری انگلیوں کو اس وقت کچھ سکون اور آرام ملنے کا موقع ملتا جب حضرت شاہ صاحب فرماتے میں کہتا ہوں انور شاہ۔ تو اس وقت ہم فورا قلم اٹھاتے۔ کہ تمام اقوال اور تمام تشریحات اہل علم کی علمائے سابقین کی مل جائیں گی، ان کی کتابوں کے اندر۔ لیکن شاہ صاحب جو فرما رہے ہیں وہ نہیں ملے گا اور ان کا قول قول فیصل قرار پاتا۔

خرافات کے باوجود حق کی طرف میلان: حضرت مفتی عباس صاحب بسم اللہ دامت برکاتہم نے فرمایا: کہ اس خطے میں بدعات و خرافات تھیں جیسا کہ ہماری دادی مرحومہ فرماتی تھیں کہ تالاب کے پورے پچھلے حصے میں عرس کے وقت دوکانیں اور میلا لگتا تھا لیکن کچھ لوگ ہدایت پر جمے ہوئے تھے اور کچھ لوگ علمائے دیوبند سے عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ ان میں سے سر فہرست عثمانی خاندان ہے، ان میں ایک شیخ جلال الدین عثمانی تھے، عابد زاہد پرہیزگار۔ عشاء کی نماز کے بعد ذکر بالجہر کرتے کبھی کھڑے ہو کر کبھی بیٹھ کر۔ خرافات کے ساتھ حنفی مسلک پر تشدد بھی تھا اور علمائے دیوبند سے والہانہ تعلق بھی۔

فرمایا کہ نوساری میں ایک لچھے دار مقرر آئے ڈابھیل سملک کے افراد بھی محفل زینت ہوئے (وہ کرسی سے ایک ایک فٹ اچھل کر تقریر کر رہے تھے) اور وہ دوران تقریر بکواس بکنے لگے، یہ حضرات کھڑے ہو گئے، مقرر صاحب کے بھی ہم نوا کھڑے ہو گئے قریب تھا کہ کرسیاں اچھلتی اور یہ گتھم گتھا ہو جاتے بلکہ وہ الجھ چکے تھے۔ یہ سب ریکارڈ موجود ہے۔

پٹیل صاحب کا عرس نہ کرنے کا عزم مصمم: حضرت مفتی عباس صاحب بسم اللہ دامت برکاتہم نے فرمایا: پہلے پٹیلی چلا کرتی تھی، حضرات علماء نے اس وقت کے پٹیل صاحب کو عرس کے ناجائز ہونے اور دین محمدی میں بدعت ہونے پر وضاحت سے بات کی تو دل سے نکلی ہوئی بات دل پر اثر کر گئی اور انھوں نے تہیہ کر لیا کہ اب عرس نہ کرنا نہ کرنے دینا ہے لہٰذا انھوں نے یکلخت

منع کر دیا۔ معاشرے میں کچھ جراثیم تھے جن کو یہ ناگوار خاطر گزر رہا تھا لیکن وہ پٹیل صاحب کے سامنے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اسی دوران پٹیل صاحب کا بچہ بیمار ہو کر جاں بلب ہو گیا، جاں بر نہ ہو سکا اور وفات پا گیا۔ تو کچھ لوگوں نے کہا ''آدم پیر کا عرس بند کیا نا تو بھوگ لگ گیا'' مگر انھوں نے کہا عرس ایک مرتبہ بند کر دیا تو اب چلنے نہیں دوں گا، میرے لڑکے کی وفات ہوئی ہے وہ مقدر ہے۔

علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دار العلوم چھوڑنے کی وجہ: ڈابھیل کی انتظامیہ نے صد سالہ کے تعلق سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ڈابھیل تشریف آوری کے بعد کے احوال پیش کیے جائیں، دار العلوم چھوڑنے کے قضیہ سے صرفِ نظر کیا جائے، کیوں کہ امت کا اختلاف بھی رحمت ثابت ہوتا ہے اور مشاجراتِ صحابہ کی طرح اختلافِ اکابر پر کفِّ لسان ہی اولی ہے۔ قضیہ نامرضیہ کے احوال اگر بحوالہ طاقِ نسیان رہیں تو وہی بہتر ہے، اور نہ ہی علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ڈابھیل آنے کے بعد اس بابت کوئی بات ارشاد فرمائی۔ اس کے باوجود ایک معزز مہمان اس کو لکھ لائے اور سنا بھی دیا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ظرف بڑا رکھیں اور کسی کے بھی تعلق سے بدگمانی حاشیۂ خیال میں نہ آنے دیں، اور یہ یقین رکھیں کہ یہ **اختلاف امتی رحمۃ** کا خوشنما ظہور تھا۔ اس سے نہ دار العلوم کا کچھ زیادہ نقصان ہوا، وہ بھی بعد میں رواں دواں رہا اور ڈابھیل کے تو دن و رات بدل گئے، ایک عظیم انقلاب اس خطہ میں رونما ہوا۔ علاوہ ازیں وسیع ظرف کے ساتھ اختلاف کا مطالعہ بھی مفید ہوتا ہے، کہ ناگہانی مواقع پر راہِ عمل متعین کرنے میں مدد فراہم ہوتی ہے۔

مولانا سید عثمان صاحب سہارنپوری فرماتے ہیں: دار العلوم کے اربابِ انتظام و اہتمام کے درمیان ایک اختلاف ہو گیا تھا۔ قصہ اس کا مختصر یہ ہے کہ مفتی اعظم دار العلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی نے ایک فتویٰ لکھا۔ یہ فتویٰ دراصل طلبہ دار العلوم کی ایک اصلاحی تحریک کے سلسلے میں صادر ہوا۔ طلبہ دار العلوم کی خواہش تھی کہ دار العلوم کے مختلف شعبوں میں بعض ضروری اصلاحات پر توجہ کی جائے، جیسا کہ شعبہ تبلیغ، کتب خانہ اور ضروریاتِ طعام۔ ان کے علاوہ طلبہ کا یہ بھی خیال تھا کہ دار العلوم میں ایک بڑا شعبۂ تبلیغ بھی ہونا چاہیے جس کا باقاعدہ ایک نصاب ہو اور اس کی درسی کتابوں کی طرح تعلیم دی جائے۔ اس وقت کے طلباء کے لیے کسی دار المطالعہ کا انتظام نہیں تھا اور طلباء چاہتے تھے کہ طلباء کے مطالعے کے لیے مستقل اہتمام و انتظام

ہو اور اس کے لیے قدیم و جدید کتابیں فراہم کی جائیں۔ نیز طلباء کو کچھ اور مزید سہولتیں بھی دی جائیں۔ یہ سب طلباء کا مطالبہ تھا، اس وقت کی تحریک آواز اٹھا رہی تھی، مگر دار العلوم کے اربابِ انتظام اور ممبرانِ شوریٰ اس پر توجہ کے لیے تیار نہیں تھے۔

چند بڑے محترم اساتذہ طلباء کی تجویز کے حق میں تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی باتوں پر توجہ کی جائے اور ان میں سے چند معاملات میں طلباء کے مطالبات کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ یہ بات چلی گئی تھی دار العلوم کے صدر مفتی کے پاس۔حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی دوران ایک فتویٰ لکھ دیا۔ اس میں طلباء کے مطالبات کی تائید کی اور بعض ایسے مسائل پر اظہارِ خیال کیا گیا تھا جس سے اربابِ انتظام متفق نہیں تھے۔ اربابِ اہتمام کی طرف سے حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب سے کہا گیا اور غالباً تحریری ہدایت بھی دی گئی کہ وہ اپنے اس فتوے سے رجوع کریں، مگر مفتی صاحب نے اس سے انکار فرما دیا اور اپنی ایک تحریر میں لکھا کہ میں اصلاح جماعت کو قطعاً حق و صداقت پر سمجھتا ہوں۔

حضرت کے اس فتوے کی حضرت شاہ صاحب علامہ انور کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے تائید اور کھل کر ہم نوائی فرمائی۔جس کی وجہ سے دار العلوم اور حضرت علامہ کشمیری کے درمیان ایک فاصلہ ہو گیا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہ وہ اسباب ہیں جن سے حضرت نے دل برداشتہ ہو کر علیحدگی کا فیصلہ فرمایا۔اس پر اربابِ اہتمام نے دار العلوم کی شوریٰ کا اجلاس بلایا، مگر اس میں اصلاحِ حال کی کوئی صورت پیش نہ آئی۔ علامہ کو بھی شاید اس کا احساس ہو گیا تھا، اس لیے دار العلوم دیوبند سے وطن جانے کے لیے دو مہینے کی رخصت لے کر ۲۶/ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ، بمطابق ۲۹/ مئی ۱۹۲۷ء کو دیوبند سے روانہ ہو گئے۔

حضرت کے جانے کے بعد جب یہ بات عام ہوئی کہ علامہ نے دار العلوم کی صدارتِ تدریس چھوڑ دی ہے اور مدرسہ سے علیحدہ ہو گئے ہیں، تو اس کا پورے ملک میں چرچہ ہوا، سخت ردعمل ہوا، اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں۔ تو اربابِ انتظام کو اس کا احساس ہوا کہ یہ خود دار العلوم کا نقصان ہوا۔اس لیے پھر یہ کوشش ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب کو دار العلوم میں دوبارہ مسندِ تدریس پر واپس لایا جائے اور حضرت کی خدماتِ حدیث بحال فرمائی جائیں، لیکن حضرت نے اس کو پسند نہیں فرمایا اور کشمیر سے ۱۳/ صفر ۱۳۶۵ھ بمطابق ۲۳/ اگست ۱۹۴۶ء کو

دار العلوم دیوبند میں استعفیٰ بھیج دیا۔ جب حضرت علامہ کے دار العلوم سے علیحدہ ہونے کی تصدیق ہو گئی، اس وقت مختلف اصحاب اور اداروں کی جانب سے یہ کوشش اور جد وجہد ہوئی کہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب ان کے ہاں تشریف لے آئیں اور ان کے ادارے کو اپنے قیام سے عزت بخشیں۔ جن میں دو شخصیات بڑی اہم اور قابلِ قدر ہیں:

ایک بڑی شخصیت شاعر مشرق علامہ اقبال۔ علامہ اقبال صاحب نے چاہا کہ آپ لاہور تشریف لائیں، لاہور میں اپنا فیض پہنچائیں۔

دوسرے گجرات کے بڑے عالم، ہمارے موجودہ مہتمم صاحب کے جدِ امجد حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب۔ یہ دونوں حضرات اپنی اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

حضرت علامہ اقبال صاحب کا حضرت شاہ صاحب سے قدیم رابطہ اور خط و کتابت تھی۔ علامہ اقبال کے حضرت علامہ انور شاہ کے ساتھ تعلقات کی ابتدا اکتوبر ۱۹۲۱ء، بمطابق صفر ۱۳۴۰ھ سے ہوئی، جب آپ نے لاہور میں جمعیت علماء ہند کی تجویز پر ایک بڑا جلسہ کیا تھا۔ جب ۱۹۲۵ء میں انجمن خدام الدین لاہور کے زیر اہتمام جلسہ ہوا، اس وقت علامہ اقبال نے علمائے دیوبند کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ اس میں حضرت علامہ صاحب بھی شامل تھے۔

جب علامہ کو یہ خبر ملی کہ حضرت شاہ صاحب دار العلوم سے مستعفی ہو گئے ہیں، تو انھوں نے لاہور میں ان کے قیام کا انتظام کیا اور حضرت شاہ صاحب کو لاہور آنے کی دعوت دی اور اس کے لیے فوراً تار کیا۔ مولانا عبد الحنان صاحب ہزاروی فرماتے ہیں کہ جب علامہ صاحب نے دار العلوم سے استعفیٰ دے دیا، میں ان دنوں لاہور کی مسجد میں خطیب تھا۔ ڈاکٹر صاحب یعنی علامہ اقبال نے دیوبند تفصیلی تار دیا جس میں شاہ صاحب سے درخواست کی گئی کہ آپ فوراً لاہور تشریف لائیں، یہیں قیام فرمائیں۔ جوابی تار ساتھ تھا جس کا کوئی جواب نہ آیا۔ جس پر شاعر مشرق نے مجھ کو (یعنی ہزاروی صاحب کو) دیوبند بھیجا کہ تم جا کر زبانی عرض کرو۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب کو تار ذرا دیر سے پہنچا، جب ڈابھیل والوں کے اصرار پر وہاں تشریف لے جانے پر فیصلہ کر لیا تھا۔ علامہ کا پیغام بعد میں ملا۔ شاہ صاحب نے فرمایا عبد الحنان ہزاروی صاحب سے کہ: افسوس، آپ کا پیغام بعد میں ملا ہے اور میں نے ڈابھیل والوں سے وعدہ کر لیا ہے۔ اس لیے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کا لاہور جانا نہ ہو سکا۔ دیوبند سے ڈابھیل تشریف لے آئے اور

ڈابھیل میں ایک باغ و بہار آ گئی۔ بہرحال حضرت علامہ مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تشریف لائے اور اپنے زبان حال سے فرمایا:

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا بلبل سن کر میرے نالے غزل خواں ہو گئے

حضرت شاہ صاحب کی مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تشریف آوری اہلِ علم اور طلبہ حدیث کے لیے ایک صدائے دل نواز نعمتِ مترقبہ تھی۔ جس کو معلوم ہوا وہ حضرت علامہ سے پڑھنے اور استفادہ کرنے کے لیے ڈابھیل پہنچنے لگا۔ تقریباً پونے تین سو طلباء بھی دیوبند سے ڈابھیل آ گئے اور مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل بھی چند مہینوں میں، جو چھوٹا سا مدرسہ تھا، عالمی شہرت یافتہ مدرسہ بن گیا اور ایک جامعہ کی شکل اختیار کر گیا۔ حضرت مولانا عبد القیوم صاحب راجکوٹی لکھتے ہیں کہ حضرات اکابر کی آمد کے وقت طلباء کی تعداد مدرسے میں ۲۹۳/ تھی اور تعلیم مشکات و جلالین تک تھی۔ مشکات و جلالین پڑھنے والا صرف ایک طالب علم تھا۔ ان حضرات اکابر کے آتے ہی مدرسہ تعلیم الدین ترقی کر کے ایک حقیقی جامعہ بن گیا۔ اطراف سے تشنگان علوم جمع ہوئے اور اس دور افتادہ غیر معروف بستی میں یکا یک علومِ نبوت کے پروانے ٹوٹ پڑے۔ پیشاور، سندھ، کابل، قندھار، ترکی، برما، ڈھاکہ، بخارا، سمرقند، موریشس، رنگون، ایران، چین، بہار، مدراس، ہزارہ، چاٹ گام، گجرات، منگلور، بنگال، یوپی اور دکن سے طلباء جوق در جوق آنے لگے۔ صرف ایک ہی سال یعنی ۱۳۴۷ھ کے اوائل میں طلباء کی تعداد ۴۰۰/ سے بھی زیادہ ہو گئی، جس میں صرف دورہ حدیث شریف کے طلبہ کی تعداد ۵۹/ تھی۔ اور جامعہ ڈابھیل بڑے مدرسوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ انتھی کلامی

یہ مقالہ انتظامیہ کو ممکن ہے ناگوارِ خاطر گزرا ہو، کیوں کہ یہ ان کے طے کردہ امور اور اصول کے خلاف تھا۔ اور اس سے کہیں کوئی دار العلوم سے تقابل کا پہلو نہ نکال لے، اس لیے جامعہ کے استاذ مفتی معاذ صاحب نے معاً بیانیہ دیا کہ جب صد سالہ اجلاس کے امور طے کیے جا رہے تھے تو یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ڈابھیل آنے کے بعد کے احوال پیش کیے جائیں گے۔ اور یہ بیانیہ بھی دیا کہ جامعہ ڈابھیل، دار العلوم دیوبند کی ایک ادنیٰ شاخ ہے۔

ایک اہم سبق آموز اور واقعات سے لبریز تحریر مفتی عمران صاحب کی ان کے شکریہ کے اور کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ شامل کی جاتی ہے۔ (یہ باتیں بندہ تحریر کرنا چاہتا تھا لیکن جب یہ تحریر آ گئی تو اب ضرورت باقی نہیں رہی۔)

جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کے دورہ حدیث کے سو سالہ جلسے کے کچھ چنے ہوئے موتی

اکابرین مدارس کی خاص خوبیاں: (۱)توحید کامل اور کفر و شرک سے بچنا(۲) اتباع سنت و ترویج سنت (۳) تعلق مع اللہ ، احسان و احتساب (۴)اعلائے کلمۃ اللہ، دینی غیرت، عقائد کی حفاظت۔

مدرسہ کے لیے بیوی کے زیور بیچے: بانی حضرت احمد بھام کے بیٹے حافظ خلیل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:مولانا احمد بھام رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ کی ترقی کے لیے اپنی بیوی کے زیور بیچ دیے تھے۔

جامعہ ڈابھیل کی بنیاد میں درود کی روحانیت: حضرت مولانا احمد حسن بھام نے جب مدرسہ کی بنیاد رکھی تو ایک لاکھ مرتبہ درود پڑھا۔ پہلے ہی دن سے اثر تھا، بعد میں روزانہ ختم خواجگان کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

مدرسہ کی کارگزاری: ایک چھوٹے گھر سے مدرسہ شروع ہوا۔ پہلی روداد (رپورٹ) میں سب اساتذہ کی الگ الگ ذمہ داریاں لکھی گئیں۔

مولانا احمد صاحب بھام اپنے نام کے سامنے لکھتے تھے: ''میری سب ذمہ داریاں ہیں۔'' صرف چھ مہینے میں مدرسہ کا دائرہ پھیل گیا۔

جامعہ کی مقبولیت کا خواب میں اشارہ: جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کے اول زمانے میں اس کے بانی کے ہمدرد اور مفکر بزرگ مفتی مرغوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ان کا علمی تعلق مولانا احمد بزرگ رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔مولانا احمد بزرگ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خواب دیکھا:انھوں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بڑے درخت کے سائے میں آرام فرما ہیں۔مولانا احمد بزرگ نے خواب میں سوچا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر لے جائیں، لیکن وہ اٹھا نہ پائے۔تب ان کی نگاہ حضرت مولانا احمد بھام پر پڑی، جو وہاں کھڑے تھے۔

مولانا احمد بزرگ نے ان سے کہا:''میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر کو اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں، آپ میری مدد کیجیے۔'' دونوں نے مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھایا اور گھر لے گئے۔خواب کی تعبیر میں بزرگوں نے فرمایا:رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اطہر اصل میں دین کی نسبت اور علم نبوت

کی طرف اشارہ ہے۔مولانا احمد بزرگ کا اکیلے نہ اٹھا پانا مطلب کہ اتنی بڑی ذمہ داری ایک شخص کے لیے ممکن نہیں۔مولانا احمد بھام کی مدد لینا مطلب بزرگوں کی اجتماعی کوشش سے یہ امانت اٹھائی جائے گی۔اس سے اشارہ ملا کہ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل رسول اللہ ﷺ کے علم اور سنت کا مرکز بنے گا، اور بزرگوں کی جماعت اس کو اپنے علاقے تک لے جائے گی۔

آداب حدیث و اہتمام اصول حدیث: حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جب دیوبند سے الگ ہوئے تو لوگوں نے کہا:''مسجد میں درس شروع کر دیں، پورا دورہ حدیث آ جائے گا''۔آپ نے فرمایا:'' کسی محدث کے لیے جائز نہیں ہے کہ ایک جگہ درس حدیث ہوتا ہو تو اس کے مقابل دوسرا درس شروع کرے میں یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا چنانچہ اسی لیے انھوں نے ڈابھیل کا قیام اختیار فرمایا اس زمانے میں ڈابھیل کا حال یہ تھا کہ نہ یہاں کمرے تھے نہ سہولت ۔ ڈابھیل سے سملک جانے کے لیے ٹخنوں سے اوپر تک کیچڑ میں چل کر کے جانا ہوتا تھا لیکن حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے مقابل درس دینا انھوں نے پسند نہیں کیا۔

ختم نبوت کے سلسلے میں آپ کی خدمات: علماء نے فرمایا ہے کہ صرف رد قادیانیت نامہ ہی آپ کے مساعی کو زندہ بنانے کے لیے کافی ہے آپ سے پہلے علمائے اسلام ختم نبوت اور حیات مسیح کے عنوانات پر قادیانیوں کے خلاف اعتقادی جنگ کر چکے تھے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ احتیاط کی تمام منزلوں سے گزر کر مرزا قادیانی کے حق میں کفر کا فتوی دے چکے تھے لیکن ابھی تک بطور جماعت قادیانیت کو ایک غیر مسلم اقلیت نہیں کہا گیا تھا اور نہ قادیانیت کو ہندوستان سے آگے گزر کر پوری امت کے خلاف ایک عالمگیر دجالی فتنہ قرار دیا گیا تھا حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے مرزا قادیانی کی اس دجالی تحریک کے خلاف دعوت حفظ ایمان کی اواز لگائی۔ بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان نے انجمن دعوت و ارشاد قائم کی اور حضرت شاہ صاحب نے اپنے تمام شاگردوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی اور حکومتی سطح پر قادیانیوں کے مسلمانوں کے ساتھ رہنے کے نقصانات بیان کیے۔حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی بیماری کی حالت میں رد قادیانیت اور حفاظت ناموس رسالت کی خاطر اپنا مشہور زمانہ سفر بہاولپور کیا تھا۔

یہ جہاں فانی ہے کوئی چیز لافانی نہیں پھر بھی اس دنیا میں انور شاہ کا ثانی نہیں

آپ فرمایا کرتے : گلی کا کتا بھی ہم سے بہتر ہے اگر ہم تحفظ ختم نبوت نہ کر سکے ایک

موقع پر ارشاد فرمایا میں یہ بات علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ حدیث کی خدمت بھی اللہ کا فضل ہے، قرآن کی خدمت بھی بہت اہم خدمت ہے تفسیر کی خدمت بھی بہت بڑی سعادت ہے فقہ کی خدمت بھی بہت بڑی نعمت ہے تبلیغ کرنا بھی بہت اچھا کام ہے لیکن تحفظ ختم نبوت سرکار دو عالم ﷺ کی ذات کا تحفظ ہے باقی چیزیں اقوال کا تحفظ ہیں اعمال کا تحفظ ہے افعال کا تحفظ ہے، آپ ﷺ کی سیرت کا تحفظ ہے لیکن ذات کا تحفظ ان سب سے اولی اور افضل ہے، آگے کا جملہ لے کر جایئے اور اس کو اپنی زندگی کا مشن بنایئے شاہ صاحب فرماتے ہیں جس شخص نے بھی عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے ایک گھنٹہ بھی کام کر لیا اسے حضرت نبی پاک ﷺ کی شفاعت ضرور نصیب ہو گی۔ (از مفتی محمود صاحب بارڈولی)

علماء کی خدمت: حضرت شاہ صاحب کو جس گائے کا دودھ ملتا تھا، اس گائیں کو مختلف پھل اور عمدہ غذائیں کھلائی جاتیں تا کہ قوت حافظہ مضبوط رہے اور دیسی خصی مرغ کھلایا جاتا۔ ڈابھیل والوں نے علماء کی خدمت کے لیے مرغ کو خصی کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ان کے گھر والے مشکل میں تھے، کیونکہ حضرت نے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ان کے شاگرد مولانا محمد میاں سملکی افریقی نے ان کے اہل و عیال کے لیے ایک ماہانہ رقم مقرر کی اور ان کی اہلیہ کو حج پر بھی بھیجا۔

ڈابھیل مدرسہ سے انگریزوں کے خلاف فتویٰ: جنگ آزادی کے دور میں کسانوں پر انگریزوں نے ظلم کیا، بہت ٹیکس لگائے۔ ولبھ بھائی پٹیل (جو اس وقت "سردار" نہیں بنے تھے) نے کسانوں میں تحریک چلائی کہ ٹیکس نہ بھرو۔ انگریزوں نے جائیداد ضبط کرنی شروع کی۔ بارڈولی کے پٹیدار سماج نے فتویٰ پوچھا کہ: "انگریز کا ٹیکس دینا جائز ہے یا نہیں؟ کسان کی ضبط شدہ جائیداد خریدنا جائز ہے یا نہیں؟" حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ڈابھیل سے فتویٰ شائع ہوا: "ٹیکس نہ دو، اور وہ جائیداد نہ خریدو۔" قرآن کی آیت ہے: "برائی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو" (سورۃ مائدہ) کا حوالہ دیا۔ اس فتوے سے انگریزوں میں ہلچل مچ گئی، پریس ضبط ہوا، مفتی عتیق الرحمن صاحب کو گرفتار کیا گیا۔ ہم فخر سے کہتے ہیں کہ آزادی کی لڑائی میں ڈابھیل مدرسہ نے بھی حصہ لیا۔ اسی فتوے سے ولبھ بھائی "سردار" بنے، ان کی تحریک کامیاب ہوئی اور انگریز کے قدم لرز گئے۔

کاوی کے حلوے کی مقبولیت کی وجہ: حضرت مولانا ابراہیم صاحب کاوی رحمۃ اللہ علیہ، ڈابھیل کے استاد، فرماتے تھے: کاوی کے ایک حلوے والے (نام بھول رہا ہوں) حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حلوہ پیش کرتے تھے اور آپ دعا فرماتے۔ اس حلوے کی مقبولیت ان کی دعا کا اثر ہے۔

قرآن سے عشق کا واقعہ: مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ حافظ تھے۔ روزانہ اوابین میں آٹھ پارے پڑھتے۔ ایک مرتبہ نماز میں یہ آیت: وَبَرَزُوا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ بار بار پڑھتے رہے۔ پوری مسجد رو رہی تھی۔ بار بار سننے سے لوگ زمین پر گر گئے، لیکن حضرت مفتی صاحب برابر کھڑے رہ کر پڑھتے رہے۔

ڈانڈی مارچ میں جامعہ کا حصہ: مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں گاندھی جی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پوچھا: ''ہم نے سنا ہے اسلام میں بھی نمک پر ٹیکس منع ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''جی ہاں، حدیث میں پانی، گھاس اور نمک پر ٹیکس منع ہے'' گاندھی جی نے کہا: ''فتویٰ ریفرنس کے ساتھ دیجیے۔'' دوسرے دن اساتذہ نے فتویٰ پیش کیا۔ ناڈوی کے جلسے میں گاندھی جی نے کہا: ''اس فتوے نے میری طاقت اور ہمت بڑھادی۔'' دھامن میں آنے پر مسلمانوں نے ان کی تحریک کے لیے ۵۱/ روپے، اور ہندوؤں نے ۲۵/ روپے چندہ دیا۔

گائیکواڑ خاندان کا تعارف: جامعہ جب سے قائم ہوا، تب سے آج تک برادرانِ وطن میں اچھے تعلقات رہے۔ انہی میں سے گائیکواڑ خاندان ہے، جو گجرات کے مختلف علاقوں میں بسا ہوا ہے۔ یہ خاندان علمی، سماجی اور دینی کاموں میں مشہور ہے۔ ڈابھیل کے علاقے میں بھی ان کے اثرات قابل ذکر ہیں۔ جب ڈابھیل میں تعلیم الدین کا نظام برپا ہوا، تو گائیکواڑ خاندان نے بھی اس کام میں حصہ لیا۔ عمارت، مدارس، کتب خانہ، طلبہ کے لیے دارالاقامہ — سب میں ان کا تعاون رہا۔

———————

صد سالہ اجلاس نے ہمیں کیا دیا

﴿سبق آموز پیغام اور نتائج و اثرات﴾

آج اس عظیم الشان اجلاس کو ایک ہفتہ بیت چکا ہے دل و دماغ اسی میں محو گردش ہے کسی فاضل نے کیا خوب لکھا تھا" صد سالہ اپنی ظاھری شکل سے ختم ہوا ہے نہ کہ فضلاء کے قلوب سے درون سے صدائے پیہم ہے صد سالہ صد سالہ"۔

آج میں سوچ رہا ہوں کہ صد سالہ اجلاس نے ہمیں کیا دیا تو بہت سی باتیں ذہن میں گردش کرنے لگتی ہیں مناسب معلوم ہوا کہ ان کو سپرد قرطاس کر دیا جائے۔ جامعہ ڈابھیل کا صد سالہ اجلاس محض ایک تقریب نہیں تھا بلکہ تاریخ کی ایک روشن کڑی تھی۔ یہ اجلاس ہمیں ماضی کی قربانیوں، حال کے تقاضوں اور مستقبل کے اہداف کی یاد دہانی کراتا ہے۔ ایک صدی قبل جب اس ادارے کی بنیاد رکھی گئی تھی، اس وقت وسائل کی کمی، حالات کی سختی اور سہولتوں کا فقدان تھا، اکابرین کو سملک سے ڈابھیل کیچڑ میں آنا پڑتا، نہ عمارتیں تھیں نہ صاف ستھری درسگاہیں نہ آرام دہ سواریاں۔ مگر اخلاص، عزم اور اللہ پر بھروسے نے ایک چھوٹی سی شمع کو رفتہ رفتہ آج علم و دین کا عظیم روشن مینار بنا دیا۔

یہ اجتماع ہمیں سب سے پہلے اجتماعیت اور اتحاد کا سبق دیتا ہے۔ جب ایک مقصد کے لیے علما، طلبہ، فارغین اور بہی خواہان جمع ہوں تو دین کی صدائے حق پوری قوت کے ساتھ بلند ہوتی ہے۔ یہ اتحاد ہی ہے جس نے جامعہ کو ایک مضبوط قلعہ بنایا اور دین کی خدمت کا عالمی مرکز بنا دیا۔ ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہمارا کام بس اخلاص کے ساتھ خدمت کرنا ہو پھل دینا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، کسی کام میں فوری نتیجہ کی تمنا نہ کریں کبھی کوئی درخت آہستہ آہستہ پھل آور ہوتا ہے۔ کسے پتا تھا کہ بھام صاحب کا یہ ننھا سا پودا اتنا تناور ہوگا کہ ایک بڑی دنیا میں اس کا پھل کھایا جائے گا۔ ہمیں سبق ملا کہ ہم علم کی بقا اور خدمت دین کے لیے ننھا سا پودا لگائیں، کیا پتا اللہ تعالیٰ کب اس میں جان ڈال دے۔

اس اجلاس نے ہمیں اسلاف کی قربانیوں کی یاد بھی تازہ کرائی۔ وہ اکابر جو پتھر کھا کر مٹھی مٹھی اناج سے جامعہ کی بنیاد مضبوط کرتے رہے وہ اکابر جو دور دراز علاقوں سے نامانوس زبان

والوں میں آئے وہ اکابر جنھوں نے ہجرت کے اس عمل کو نصرت سے چار چاند لگادیے۔

ان کی اخلاص بھری زندگیاں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ان کے نقشِ قدم پر چلنا ہی ہمارے لیے تحفظ اور بقا کی ضمانت ہے۔ جامعہ کی یہ صد سالہ بزم ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ مدارس کی اصل طاقت صرف درس و تدریس نہیں، امت کی عوام کی فکری و عملی ارتداد کی بیخ کنی بھی ہے ،عوام میں جڑ پکڑ چکی رسوم و بدعات کا ازالہ بھی ہے اور ختم نبوت کا تحفظ بھی ہے۔ نیز فضلاء کی تربیت بھی ہے۔ فارغین اس باغ کے خوشبودار پھول ہیں جن سے امت معطر ہوتی ہے۔ اجلاس میں ان کا اجتماع ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ان کی صلاحیتوں کو منظم کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

دنیا بھر سے آئے فضلاء کے باہمی تعارف و ملاقات نے ان میں اتحاد، تعاون اور ہم خیالی کی ایک فضا پیدا کی ہے۔فضلاء ایک دوسرے کے رابطہ میں آئے ہیں اور ایک دوسرے کی خدمات سے واقفیت حاصل کی ہے۔ جامعہ ڈابھیل کے صد سالہ اجلاس کا ایک اہم فائدہ یہ ہوا کہ اس نے جامعہ کی آواز کو دنیا بھر تک پہنچایا، عالمی سطح پر جامعہ کی شناخت کو تازہ کیا۔فضلاء کو ایک لڑی میں پرو دیا، طلبہ کے دلوں میں شوق و حوصلہ جگایا، اور عوام کے ذہنوں میں مدارس کی عظمت کو تازہ کر دیا۔ اور جامعہ کے کردار کو جنگ آزادی سے جوڑ دیا۔

موجودہ طلبہ اور نئی نسل نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک ادارہ کس طرح سو سال بعد بھی علم و دین کا مینار ہے۔ اس سے ان میں شوق اور حوصلہ بڑھا۔ اور نسبت ایک بڑی چیز ہے طلباء و فضلاء کا اپنی اس نسبت کے احساس میں اضافہ ہوا۔

محترم قارئین! یہ اجلاس دراصل ایک پیغام ہے، ایک صدا ہے، ایک یاد دہانی ہے... کہ ادارے پتھر اور اینٹوں سے نہیں بنتے، ادارے اخلاص، قربانی اور اجتماعیت، جہد مسلسل یقین پیہم سے بنتے ہیں۔ اگر ہم نے بھی یہی جذبہ اپنی زندگی میں پیدا کرلیا تو دین کی حفاظت اور امت کی رہنمائی کا یہ سلسلہ ان شاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا۔

———————

جامعہ ڈابھیل کا صد سالہ اجلاس؛ پیش منظر و پس منظر

﴿خامہ بگوش: ابو سعد چارولیہ (خادم جامعہ ڈابھیل)﴾

صد سالہ اجلاس کے ہنگامے فرو ہوگئے، قرب و جوار اور دور و دراز سے آئے ہوئے مہمانان اپنے گھروں کو پہنچ چکے، سب چیزیں دوبارہ اپنی جگہ عود کر گئیں، مگر اب تک یادیں ہیں کہ ذہن کے کینواس سے محو نہیں ہوتیں، باتیں ہیں کہ گھوم گھوم کر وہیں آ رکتی ہیں، سوچا کیوں نہ ان یادوں کے سہارے کوئی تحریری مجلس آراستہ کی جائے، کیا پتا کہ کتنے عاشقانِ زار اس میں اپنی تصویر دیکھ پائیں اور کتنے ہجر کے ماروں کو قرار آجائے تو لیجیے، قلم اٹھاتے ہیں۔

چل میرے خامہ بسم اللہ

خدائے بزرگ و برتر کا کس زبان سے شکر ادا کیا جائے کہ صد سالہ اجلاس کامیابی کو پہنچا، اس کامیاب جلسے کے انعقاد کا ایک پس منظر اور ایک پیش منظر، پیش منظر تو کیمرے کے اِس زمانے میں بھی ہزاروں عینی شاہدوں نے اپنی سگی آنکھوں سے دیکھا کہ تیاریاں ہو رہی ہیں، شامیانہ لگ رہا ہے، دار الاقامہ چمکایا جارہا ہے، عمارتوں کی پیشانی پر نام چسپاں کیے جارہے ہیں، ہال دل چسپ اور تاریخی معلومات سے سنوارا جارہا ہے، کرسیاں بچھ رہی ہیں، اسٹیج سج رہا ہے، ڈیگیں چڑھ رہی ہیں، دعوت نامے گھوم رہے ہیں، فون آرہے ہیں اور جارہے ہیں، فضلا کی جماعتیں سرگرم و پُر جوش ہیں، طلبہ مشتاق ہیں کہ تاریخی جلسے کا مشاہدہ کریں، فضلا بے چین ہیں کہ انتظار کی گھڑیاں کب ختم ہوں گی، لیجیے اکتیس اگست کی صبحِ جاں فزا خدا خدا کر کے آن پہنچی، عاشقوں کا ہجوم ہر طرف سے پانی کے ریلے کی طرح آرہا ہے، جامعہ کا دروازہ اپنی کشادگی کے باوصف اور دخول و خروج کے لیے الگ الگ راستے طے کرنے کے باوجود تنگ نظر آرہا ہے۔

وقت سے بہت پہلے جلسہ گاہ کھچا کھچ بھر چکا ہے، پاؤں رکھنے بلکہ تل دھرنے تک کی جگہ نہیں، اسٹیج پر یکے بعد دیگرے مہمانوں کی آمد آمد ہے، دیکھتے ہی دیکھتے باوقار مہمانوں سے شہ نشین سج دھج گیا، تا آنکہ صدرِ محترم، بقیۃ السلف و الخلف محبوب العلماء و الصلحاء حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم بھی تشریف لے آئے، ان کے آتے ہی صدہا پکاریں بلند ہوئیں:

صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

اناؤنسر کی شیریں مگر رندھی، پُر جوش مگر رقت آمیز آواز جامعہ کی فضا میں گونج رہی ہے، بانیٔ جامعہ حضرت مولانا احمد حسن بھام سملکی کے سبق آموز حالات و واقعات کانوں سے ٹکرا کر دل میں اتر رہے ہیں، ایک ایک لفظ دل پر دستک دے رہا ہے، اس گنہگار نے اپنی دیدۂ تر سے بہتیری آنکھوں کو بھیگا اور بہت سے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا ہوا دیکھا، کچھ دیوانے ایسے بھی تھے جن کے ضبط کا بندھن ٹوٹا، چشمِ تر سے موتی گرا، رخسار سے ڈھلکا اور خاموشی سے دامن میں جذب ہو کر فنا ہو گیا، شاید اتنے بڑے ہجوم میں سے کسی آنکھ نے نہ دیکھا ہو مگر لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ کی شان والا تو دیکھ ہی رہا تھا، ہر دل میں جذبات کا طوفان تھا، لیجیے مضامین و مقالوں کا دور شروع ہوا، ورق الٹتے گئے اور ماضی کی سنہری تاریخ آنکھوں کے سامنے آتی گئی اور وہ بھی اس تیزی سے کہ ایک ورق الٹتا اور ایک دہائی نکل جاتی، حتی کہ جام گردش کرتے کرتے میر ساقی کے سامنے آ ٹھہرا، مردِ درویش، پیرِ مغاں، سالارِ کارواں: استاذ نا المکرم کی نورانی شخصیت سے سامعین نے نور و نکہت سے سجی سنوری بزم میں نوریوں کے سردار: علامہ کشمیری کے حالات سنے، مضمون کی سلاست، معانی کی روانی اور زبان کی چاشنی کے ساتھ تاثیر و رقت کی اس سے بڑھیا مثال اِن آنکھوں نے کیوں دیکھی ہو گی! پچیس تیس منٹ کا عرصہ یوں گذرا جیسے ہوا کا جھونکا، اور میر ساقی جب جام رکھ کر پیچھے ہٹا تو رندوں کی صلائے عام دھڑکتی سانوں سے ادا ہوئی۔

ایک دو بوند سے ہم رندوں کا بھلا کیا ہو گا ہم تو کہتے ہیں کہ پورا میخانہ اٹھا کر رکھ دو

مقالوں کی پے بہ پے صدا سے قریب تھا کہ طبیعتیں بوجھل ہو جاتیں اور اسٹیج نگاہوں سے اوجھل، کہیں کہیں شکم سے ''صدائے رحیل'' بھی اٹھنے لگی تھی، بھلا ہو ہمارے معزز و مکرم دوست سمعان صاحب کا کہ انھوں نے بھٹکل سے چمنستانِ جامعہ کو پکارا اور جامعہ کی تین بلبلیں بیک آواز نغمہ زن ہوئیں، نغمہ کیا تھا، چلتے پھرتے منچلوں کے قدم جما گیا، دوڑتے بھاگتے اکا دکا بچوں کی شرارت ختم کر گیا اور ادب کی زبان میں کہیں تو پرندے زمین پر اتار لایا، پہلی مجلس ختم ہوئی تو کیا اسٹیج کیا شامیانہ ہر کسی کی زبان پر اسی ترانے کا ذکر تھا۔

ظہر کی نماز شروع ہوئی تو ''محمود و ایاز'' صف بستہ نظر آئے، نماز مکمل ہوتے ہی دستر خوان سج گیا، دھوپ نہ چمکی مگر بھوک خوب چمک رہی تھی، میزبانوں نے بھی خوب نظام سنبھالا، ''العطش و الجوع'' کا نعرۂ مستانہ لگانے والے مجمع کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور مجمع نے کھانے کو

آڑے ہاتھوں لیا، سب سے اخیر میں مسجد کے مائک سے اعلان ہوا کہ طلبۂ جامعہ مطبخ میں پہنچ جائیں، تھکے ہارے مجاہدین کی کھیپ سرحدِ طعام پر خیمہ زن تو ہوئی مگر ذمے داریوں کے بوجھ تلے ایسی دبی ہوئی تھی کہ کھانے سے اپنا مشہورِ زماں انصاف نہ کرسکی۔

ابھی کمر بھی سیدھی نہ کر پائے تھے کہ دوسری مجلس کے لیے جامعہ کی مسجد باجود اپنی وسعت کے تنگ دامنی کی شکایت کرتی نظر آئی، اُدھر حالات کے ستائے، ہجر کے مارے، فراق کے ڈسے: فضلائے جامعہ یوں ہجوم کیے ہوئے تھے جیسے باز کے آہنی پنجوں سے بچنے کے لیے چوزے اپنی ماں کے پروں میں پناہ لیتے ہیں، اور اِدھر محبت کے آبشار اور شفقت کے شجرِ سایہ دار تھے جو روحانی باہیں پھیلائے مدتوں سے بچھڑے اپنے بچوں کو سکون و قرار کی دولت سے مالامال کر رہے تھے، یہ وہ کیفیت ہے جس کے سامنے بیسیوں اعلامیے ہیچ ہیں، ''پیوستہ رہ شجر سے، امیدِ بہار رکھ'' کا یہ وہ پیغام ہے جس کے قدموں میں صدہا تجاویز ڈھیر کی جاسکتی ہیں، اور یہ وہ جذبات ہیں جن کے سامنے الفاظ و تعبیرات کا کوہِ ہمالہ بھی بونا نظر آتا ہے۔

اساتذہ بول رہے تھے، نہیں جی! موتی رول رہے تھے، الفاظ نہیں تھے، پھول تھے جس کے نازک پتوں سے ہیرے کا جگر کٹا جارہا تھا اور پچاس کے پٹے پر پہنچ کر بھی کچھ لمحوں کے لیے فضلا کو لگ رہا تھا کہ ابھی بھی پہلا گھنٹہ چل رہا ہے، کچھ شریر کھڑے ہیں اور استاد جی اسی ہلکے پھلکے انداز میں اپنے لاڈلوں راج دُلاروں کو لعل و گہر سے نواز رہے ہیں۔ ابھی ''هَلْ مِن مَّزِيْدٍ'' کی ندا جاری تھی کہ دفعتاً وہ اٹھ گئے اور سانسوں کی سرگوشی سنائی دی:

یہ کون چپکے چپکے اٹھا اور چل دیا خاطر! یہ کس نے لوٹ لی محفل کی دھڑکنیں

عصر کا وقت ہوچلا تھا اور مے کشوں کی پیاس بڑھتی جارہی تھی، نماز ادا ہوئی، ''شراب الصالحین'' انڈیلی اور نمازِ مغرب پڑھ کر پھر جلسہ گاہ کو دوڑے، اسٹیج پر دو جبہ پوش عمامہ سر پر لپیٹے نمودار ہوئے، ایک کا باطن ظاہر کی طرح اُجلا، اندرون بیرون کی طرح آراستہ اور دوسرا ۔۔۔۔بس اللہ ہی رحم فرمائے، مہمانوں کی آمد ہوتے ہی آخری نشست کا آغاز ہوگیا، مقالوں کا سلسلہ شروع ہوا، کبھی اکابر کے محسن خاندان و افراد نظر آئے تو کبھی اکابر کی محنتوں کے اثرات، گاہے مجاہد ملت کی ترک تازیاں سامعہ نواز ہوئیں تو گاہے علامہ عثمانی کے شب و روز، مہمانوں کے تأثرات ہوئے، غازیپوری ترانہ بھی ننھی بلبلوں کی زبانی دھوم مچا گیا، کلماتِ تشکر و

امتنان اور دعائے مستجاب پر تاریخی اجلاس تمام ہوا اور تمام کیا ہوا تاریخ جامعہ کا روشن و تابناک باب بن کر ہمیشہ کے لیے انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔

آیئے! اس پیش منظر کے بعد دھڑکتے دل سے پس منظر بھی ملاحظہ کیجیے:

لوگاں کہتے پھرتے ہیں کہ جلسہ کامیاب رہا، مگر یہ کتنے لوگ جانتے ہیں کہ اس کامیابی کے پیچھے چھپے راز کیا ہیں، اندرونی باتوں کو منظرِ عام پر لانے اور اکابر سے ڈانٹ کھانے کا خدشہ نہ ہوتا تو نام بہ نام صد سالہ اجلاس کا ایک ایک ورق الٹتا اور اس پر بکھرا ہوا خون ایک ایک کو دکھاتا، خدمت کے طلبہ ابھی تک مطبخ میں نہیں پہنچے اس کا اعلان تو لوگوں نے سنا مگر ان کی کتنی راتیں اختر شماری میں کٹیں یہ کسی نے نہیں دیکھا، جلسے کے سلیقے، طلبہ کے قرینے اور میزبانی کے طریقے کا ذکر تو ہوا مگر یہ کون جانتا ہے کہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے کیسی محنتیں ہوئیں، کاش! مجھے کہنے کی اجازت ہوتی تو میں بتاتا کہ اس اجلاس کی تیاری کے لیے اساتذہ نے کتنے دن تک گھر کا کھانا نہیں کھایا، کتنے لانبے لانبے مشورے ہوئے، پیشانیوں پر کیسی کیسی سلوٹیں ابھریں! بالیقین مجھے ڈانٹ پڑے گی، مگر سن لیجیے کہ جب مشاورتی نشستوں کا آغاز ہوا تو بجٹ کے نام پر ایک کوڑی بھی نہ تھی، خدا جانے کون کون رویا کہ دیکھتی آنکھوں موسم بدل گیا، سورت، ممبئی، حیدرآباد کے فرزندان آگے آئے اور اس ذمے داری کے لیے اپنے کاندھے پیش کیے، بستی والے اپنے گھر کی چابیاں لے کر دوڑے کہ گھر حاضر ہے، پھر تو اندرون سے بیرون تک فرزندانِ جامعہ کا ایسا تانتا بندھ گیا کہ ایک استاد گرامی قدر کو ان سے رابطے کے لیے متعین کیا گیا، موبائل کی اسکرینیں اور فون کالز گواہ ہیں کہ بہتوں کی پیش کش پر حسنِ معذرت سے کام لینا پڑا، اللہ سلامت رکھے اِن بزرگوں کو کہ یہ باوجود عسرت کے غیرت کا کبھی سودا نہیں کرتے، سچ کہوں بندہ ذاتی طور پر ایسے متعدد اساتذہ کو جانتا ہے جنہوں نے جلسے کے لیے اپنے خانگی پیسے لگائے، ڈابھیل، سملک کالا کاچھا، آسنا ویسما کے باشندوں نے اپنے گھر کے دروازوں کے ساتھ دل کے دروازے بھی کھول دیے اور تاریخی خدمت کر کے اپنے آباؤ اجداد کی یاد دلادی۔

اعتکاف میں ٹھہرے طلبہ سہ پہر کو کتنا روئے وہ ان کا رب جانتا ہے اور خدا مست درویشوں نے کتنے آنسو بہائے وہ ان کی آنکھیں جانتی ہیں، راقم کے ایک دوست جنہیں حضرتِ والا کے دربارِ اعلی میں رسائی حاصل ہے بیسیوں مرتبہ حاضرِ خدمت ہو کر نام بہ نام دعائیں کروائیں اور ان

ہی کا بیان ہے کہ ہر مرتبہ حضرتِ والا نے پیٹ بھر بھر کر دعائیں دیں، دعائیں لے کر جب وہ شاد کام لوٹتے تو ایک ایک استاد اور ایک ایک خادم کو پکڑ پکڑ کر کہتے کہ آج حضرت نے تیرا نام لے کر یہ دعا کی، اوفلاں! تیرا نام لے کر بھی دعا کی، دن کی جلوت میں دعائیں دینے والے کے متعلق کیا آپ یہ گمان بھی کر سکتے ہیں کہ سحر گاہی خلوتوں میں وہ جامعہ کو بھول جاتا ہوگا! ''زور و زر'' سے کچھ نہیں ہوتا، سب کچھ ''زاری'' سے ہوتا ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر سودا ہے نغمۂ خام خونِ جگر کے بغیر

ہال دلہن کی طرح سج دھج گیا تھا مگر جانتے ہیں کہ اس کے پیچھے کتنی توانائیاں صَرف ہوئیں، پریس میں کتنی بھاگ دوڑ ہوئی اور میرے غیرت مند استاد کو صرف جامعہ کی خاطر پریس والوں کی کڑوی کسیلی بھی سننی پڑی، ان کے ناز نخرے بھی برداشت کیے، مقالے تیار بھی ہوئے اور چھپ بھی گئے مگر کسے معلوم کہ لکھنے والی آنکھوں کے کتنے چراغ جلے اور چھاپنے والے ہاتھوں نے کتنا دکھ سہا، وہ ایک جبہ عمامہ پہنے اسٹیج پر ٹھاٹھ سے آیا یہ تو دنیا نے دیکھا مگر لفٹ سے اترتے وقت اس کی زبان سے کانپتی آواز کے ساتھ '' اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ سَرِیْرَتِیْ خَیْرًا مِنْ عَلَانِیَتِیْ، وَاجْعَلْ عَلَانِیَتِیْ صَالِحَۃً'' صرف میرے کانوں نے سنا، تاج محل تو سبھی نے دیکھا اور اس کی دل کشی و رعنائی سے اپنی آنکھیں بھی سینکیں مگر آج اس کے معماروں کو کون جانتا ہے، صد سالہ اجلاس ہوا تو دوسرے دن سب اساتذہ و طلبہ نے آرام کیا، صبح درسگاہیں بند رہیں؛ مگر معلوم ہوا کہ سات بجے دفتر اہتمام کھلا ہے اور اس کا حاضر باش خادم سرخ آنکھیں لیے سیٹھ پر جلوہ افروز ہے، حالاں کہ میں اپنی سگی آنکھوں سے پچھلی رات دیکھ چکا تھا کہ فام ہاوس پر آلِ اکابر کی خدمت کر رہے ہیں، ناظم جلسہ نے عرض بھی کیا کہ: حضرت! آپ تشریف رکھیے، ہم دیکھ لیں گے تب بھی وہ اپنا ناتواں جسم لیے رات دو بجے تک وہیں ٹھہرا رہا اور کام کرنے والے جانتے ہیں کہ وہ صبح گیارہ بجے چھٹی ہوتے ہی روزانہ گھر جانے کے بجائے کام کرنے والے اساتذہ کے ساتھ بیٹھتا اور ان کا حوصلہ بڑھاتا، جلسے کے دوسرے دن راقم سو سا کر نیند کی تنی ہوئی چادر پھاند کر جب عصر کے بعد ناظمِ جلسہ سے ملا تو ارشاد ہوا کہ ہم تو صبح مدرسہ آ گئے تھے اور مہمانوں کو روانہ کر کے اب قبیل عصر فارغ ہوئے، راقم عرقِ ندامت سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا اور ادھر سے میری خفت مٹانے کو دعائیں دی جا رہی تھیں، ہائے! ان ہی سے سنا ہوا شعر کیسا بروقت یاد آ گیا

مکتبِ عشق کے انداز نرالے دیکھے اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

مجھے وہ لمحہ بھی یاد ہے جب اعتکاف، روزوں، دعاؤں اور صدقہ خیرات کا نظام بناتے بناتے میرے ہر دل عزیز استادِ جامعہ نے طلبۂ عزیز سے کہا کہ تمہیں جلسے میں نہیں بیٹھنا ہے، مہمانوں کو موقع دینا ہے تو معاان کے چہرے بجھ گئے، جوش سرد پڑ گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ارمانوں کا خون کر کے انھوں نے مہمانوں کا اکرام کیا، ان کے لیے بھاگے دوڑے، چیخیں سنیں، ڈانٹ بھی کھائی، خاموش رہے، سر جھکا کر دوبارہ مصروفِ خدمت ہو گئے، مہمانوں میں سے بہت سے قابلِ قدر مہمان ایسے بھی تھے جن سے دورانِ جلسہ مستفید ہونے کو دل چاہ رہا تھا مگر وقت اجازت نہیں دے رہا تھا، ان میں سے بعضوں سے بعد میں منتظمینِ جلسہ کو معافیاں بھی مانگنی پڑیں، بہتیرے خدام سے بعد جلسہ کنوینر نے کہا کہ: ”بل دیجیے تو انھوں نے کہا کہ: دل لیجیے“، کس کس کی قربانی کو یاد کیجیے اور کس کس کو چھوڑیے!

یہ تو ایک جھلک ہے، ورنہ صبحِ خوش ہنگام سے پہلے کیا کیا قیامتیں ٹوٹی ہیں وہ تو جلسے سے وابستگان کا دل جانتا ہے، کسی کا نام لے کر ان کی خدمت کی قیمت گھٹانا نہیں چاہتا، نہ انہیں صلے کی تمنا ہے نہ ستائش کی آرزو، یہ سب اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ. پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں، شادؔ عظیم آبادی سے معذرت کے ساتھ ہم ان کے دو مصرعوں پر اِن بکھرے جذبات کو ختم کرتے ہیں۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں؛ ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم
اے اہلِ زمانہ! قدر کرو، نایاب نہیں، کمیاب ہیں ہم

ترانہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل-سملک گجرات

(بہ موقع صد سالہ اجلاس، ۷؍ربیع الاول ۱۴۴۷ھ، مطابق ۳۱؍اگست ۲۰۲۵ء)

نتیجۂ فکر: خاک پائے مصطفیٰ محمد سمعان خلیفہ ندوی، بھٹکل (کرناٹک، انڈیا)

مرکزِ فکر وفن، اے ہمارے چمن علم کی انجمن تو ہے نازِ وطن
آفتابِ سعادت کی نوری کرن تجھ پہ قربان ہے مال وزر، جان وتن
اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

کاروانِ عزیمت کی بانگِ درا رہروانِ شریعت کا قبلہ نما
تشنگانِ طریقت کا تو مے کدہ اور عُشّاق پر ابرِ سایہ فگن
اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

جہل کی دھوپ میں علم کا سائباں ظلمتِ دہر میں نور کا آشیاں
ہر قدم گل فشاں ہیں بہاریں یہاں جیسے فردوس کی تجھ کو حاصل پھَبن
اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

اہلِ گجرات کا مایۂ افتخار اہلِ فن کا رہا مرکزِ اعتبار
تو گلستانِ طوبیٰ کی ہے شاخسار تو ہے مُشکِ خُتَن، تجھ سے بُوئے چمن
اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

رازہائے محبت کی تفسیر تو قوم وملت کے خوابوں کی تعبیر تو
میری ساری امنگوں کی تصویر تو تو ہے اسلاف کے دل کی سچی لگن
اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

خاکِ سملک سے اُٹھی وہ موجِ شمیم جس سے گلشن میں رقصاں ہے بادِ نسیم
جس پہ نازاں عروسِ بہارِ نعیم تیرے معمار تھے بھام احمد حسنؒ

اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

علم کی شمع کے پاسباں تھے بزرگؒ حق کے اسرار کے ترجماں تھے بزرگؒ
دل کی اقلیم کے رازداں تھے بزرگؒ جن سے جُوئے محبت ہوئی نغمہ زن

اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

یاد تجھ کو رہے گی وہ صبحِ قرار جب ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
غازیِ صف شکن اور شب زندہ دار گلستانِ ہدایت کے سَرو وسمن

اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

انورِ شاہؒ تھے قافلے کے امیر دشتِ ظلمات میں روشنی کے سفیر
علم کے چرخ پر تھے جو بدرِؒ منیر رشکِ فردوس اُن سے تھے صحرا وبَن

اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

دستِ شبیرؒ نے خود نکھارا تجھے حفظِ رحمانؒ نے ہے سنوارا تجھے
اور یحییٰؒ کا بھی تھا سہارا تجھے ارضِ ڈابھیل کا تجھ سے ہے بانکپن

اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

تجھ پہ محوِ کرم تھے سراجؒ رشید ایک مردِ خدا باکمال وسعیدؒ
شانِ ادریسؒ بھی ہے مثالِ فرید تھے یہ تیرے گُل ولالہ ونسترن

اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

تیری مَسند کی زینت ہیں مردِ خلیق ساقیِ مے کدہ مہربان وشفیق
تیری خِلعت رہی ہے قَبائے عتیقؔ تھے عزیزؔ اور یوسفؔ بھی فخرِ زمن
اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

احمدؔ باوفا، احمدؔ باصفا اہلِ حق کی نوا، اہلِ حق کی صدا
شمعِ بزمِ ہدیٰ، اہلِ دل کی ضیا جھومتے جھومتے کہتی جائے پوَن
اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن

ساقیا! مے کدہ تیرا آباد ہو تیرے رندوں کا دل تجھ سے پھر شاد ہو
تیرا پیمان اُن کو سدا یاد ہو ہے یہ سمعانؔ کے لب پہ شیریں سخن
اے ہمارے چمن اے ہمارے چمن